ڈاکٹر ترنم منصوری

Assistant Proffesor, Govt. College, Jahazpur, Rajasthan

E-Mail: tarannummansuri1985@gmail.com

اردو ادب کی چند نمائندہ خواتین ناول نگار

(قدیم سے لے کر حال تک)

Abstract:

Novel writing is the most prominent part of the Urdu literature from its beginning. Many novel writers become most famous as here almost all the topics of these were based upon the happening & realities of our day today life & were connected with the important movements of our lives.

If we see the definition of the novel - it's a story of lives of the human character based on plots & social environments having the problems, questions with their solutions, answers what ever seen & experienced by the novel writers.

The first work of the Urdu novel is Islah-un-Nisa by Rashid-un-Nissa describing a feminine character with the intensions of social reforms & criticizing all the evils & customs restricting a woman to standup individually with her education, merits, skills, experience & knowledge. It relates to the year 1894, where no Islah-un-Nisa or Rasheed-un-Nisa was allowed to go to school, college & university for their education & they were deprived of living their independent life. This was the reason the writer create a false character in the name of Islah-un-Nisa. The other very important & famous novel is Akhtar-un-Nisa Begam written by Nazar Sajjad Haider & her other works named as Aah-e-Mazlooman, Janbaaz, Najma, Surayya, Mazhab aur Ishq and Zaalim Mohabbat, Andhera Khawaab & Taiyabba Begum by Hijab Imtiyaz Ali Taaj & many others were the prominent writers during that time.

The feminine feelings, emotions, educations, social & cultural restrictions were the main themes of these novels with the intension to improve the life styles of the females as per right of gender equality. The female novels writers of that time very honestly enlightened the social evils, customs & cultural restrictions for female keeping them under controls of male. The writers put up their suggestions by criticizing all these & advocated for female education & right of equality. While we examine the art & style of novel writing we find the stories of our real day to day lives keeping apart the imaginations of these novel characters.

Later on Ismat Chughtai wrote Ziddi, Tehri Lakeer, Masuma, Soudai & Ek Qatra Khoon. The Qurratulain Haider's novels Mere Bhi Sanam Khane, Safina-e-Ghum-e-Dil, Aag ka Dariya, Akhari Shab ke Humsafar, Dilruba, Gardish rang e Chaman,Patjhar ki Awaz,Kar e Jahan Daraz hai & many more.

When we read the novel of this era, we see the female novel writers highlighting the realities & prevailing with the social restrictions in the way of women equality & in getting them stand up for sharing the responsibilities of families with respect. Here the novel writers pointed out all the realities of the women in the society, in the household matters with their feelings, emotions & mindset for women freedom yet the writers used high skills & techniques of novel writing.

Jamila Hashmi also wrote novels named as Talaash-e-Baharaan, Atish-e-Rafta, Ruhee. In the same way Khadija Mastoor also written novels - Aangan, Zameen and we also see Raziya Faseeh Ahmad with her novel Simmi, Aabla paa, Bhuli hui Manzil, Intizar Mousam-e-Gul & Jeelani Bano's novel Aiwaan-e-Ghazal, Baarish-e-Sang were published.

When we read the novels of this era, we see the female novel writers highlighted freedom fighting movement & painful happenings of partition of India with its effects over the personal & social lives before & after partition of both Hindus & Muslims.

Tarannum Riyaz wrote Moorti, Barf Aashna Parindey and now we also see novel of Sarwat Khan Named Andhera Pag, Sadiqua Nawab's Novels Kahani Koi Sunao Mitasha, novel Jane Kitne Mod by Asha Prabhat, Dastaan

Ek Misali Khatun ki by Shahina Begum.

In this era, we see the female novel writers pointed out all the feelings, emotions & realities of the women in the modern & commercial world. After Independence of India, Urdu language was the official language of Courts, Police, Revenue & all the Govt. workings. Tazirat-e-Hind, Civil & Criminal laws were all in Urdu language. Later on Hindi cinema, All India Radio, TV Serials & News all promoted Urdu language to a great length which unfortunately losing its place in the present times.

اردو میں ناول نگاری کی تاریخ گو زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ناول نے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام بنایا۔ جس کے سبب اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اردو ناول نگاری کا آغاز ۱۸۶۹ء میں نذیر احمد کے ''مراۃ العروس'' کی اشاعت کے ساتھ ہوا۔ یہ ناول کا تشکیلی دور رہا ہے اور اسی دور میں خواتین نے بھی ناول لکھنے شروع کیے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورت کی زندگی، سماج، تہذیب، تعلیم، روشنی اور اصلاح جیسے موضوعات کو جگہ دی تو یہ ناول قارئین میں بطورِ خاص خواتین میں بہت مقبول ہوئے اور مثبت پہلو یہ نکلا کہ ناول کی تخلیقی فضا تعمیر ہوئی اور خواتین نے بھی اس طرف رجوع کیا۔

اس دور کی پہلی خواتین ناول نگار ''رشید النساء بیگم'' ہیں جنھوں نے ایک اصلاحی، سماجی اور معنوی سطح کا ناول ''اصلاح النساء'' تحریر کیا اس بارے میں ڈاکٹر آصفہ واسع لکھتی ہیں کہ:-

> ''رشید النساء نے نذیر احمد کے زمانے میں ''اصلاح النساء'' لکھا تھا جو ۱۸۹۴ میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ رشیدہ النساء پٹنہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے خاندان میں ابتدا سے علم کا چرچا تھا، لیکن اردگرد کے ماحول میں جہالت، توہم پرستی اور غلط عقائد کا جال پھیلا ہوا تھا۔ موصوفہ چاروں طرف علم کی روشنی بکھیرنا چاہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ''اصلاح النساء'' لکھ کر معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور جہالت کی خامیوں کو دور کرنا چاہا۔(۱)

رشید النساء بیگم روشن خیال اور دور اندیش خاتون تھیں ۔انھوں نے اپنے ناولوں میں تعلیم غلط رسم ورواج اور خاص کر کے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا۔''اصلاح النساء'' کا سنِ اشاعت ۱۸۹۴ء ہے یہ وہ زمانہ تھا جس میں خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہندوستانی معاشرے کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ شریف زادیاں اپنا نام ظاہر نہیں کرتی تھیں اس لیے رشید النساء نے بھی''اصلاح النساء'' میں اپنا تعارف اصل نام کے بجائے والدہ محمد سلیمان بنت سید وحید الدین خاں وہمشیرہ سید امام اثر کے طور پر پیش کیا ہے۔اس بارے میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں کہ:۔

> ''بہار میں خواتین کو پس منظر میں رکھنے کا عمومی رویہ تھا جس کی بناء پر رشید النساء کے نہایت معتبر اور با اثر خاندان کی جانب سے ان کی صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کیا۔یہی وجہ تھی کہ''اصلاح النساء'' کے پہلے ایڈیشن میں کہیں ان کا نام نظر نہیں آتا اور وہ خود کو کسی مرد کی ماں ،بیٹی اور بہن بتاتی ہیں ۔ایک ایسے روایتی ماحول میں ان کے خاندان کے ولایت پلٹ اور نائٹ ہڈ کا اعزاز پانے والے مرد حضرات ،انعام کے لیے سرکاری دربار میں ان کی کتاب تو کیا بھیجواتے ،انہوں نے رشید النساء کی کوششوں کو سراہنے کی زحمت بھی نہ کی ۔ یہ تو ان کی موت کے دس ،بیس برس بعد کا قصہ ہے کہ ان کا نام اردو کی پہلی خاتون ناول نگار کے طور پر سامنے آنے لگا۔''(۲)

''اصلاح النساء'' مسلمان خواتین کی اصلاح کے لیے ضبط تحریر میں لایا گیا۔اس کا بڑا مقصد مسلمان گھرانوں میں در آنے والی غلط رسومات اور توہمات کو دور کرنا تھا۔جس میں خواتین کے مسائل اور معاشرہ کی خامیوں کی نشاندہی کر کے اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔عظیم الشان صدیقی اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

> ''اس ناول میں گھریلوں معاشرت کے نقوش گہرے اور واضح ہیں ۔عورتوں کی توہمات ،شادی بیاہ کی رسومات وغیرہ جزئیات کے ساتھ پیش کی گئی ہیں عورت کی زبان ،رمز وکنایہ ،محاورے ،کہاوتیں سب میں خاندانی روایات وخصائل کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔''(۳)

رشیدالنساء بیگم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ آپ کبھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ نہیں گئی تھیں بلکہ انہوں نے خود ہی پڑھنا، لکھنا سیکھا اور اپنی لڑکیوں کو بھی علم سے آراستہ کیا۔ گھر میں کتابوں کی کمی نہ تھی۔ آپ کی خواہش تھی کہ مسلم خواتین بھی تعلیم حاصل کریں تاکہ معاشرے میں عورتوں کی پست حالی اور ان کے ساتھ ہو رہے استحصال کو دور کیا جا سکے۔ وہ اپنے جائز حقوق کو حاصل کر سکیں۔ اسی سبب انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کروایا۔ اسی مدرسہ میں ان کی بیٹی، چچی اور پھوپھی نے بھی تعلیم پائی۔ اس بارے میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں کہ:-

> ''انہوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی، اس کے باوجود انہیں زنانہ مدرسہ کھولنے کا شوق بے حد و بے حساب تھا۔ اس شوق کو انہوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں پورا کیا۔ 1906ء میں انہوں نے ایک زنانہ مدرسہ ''مدرسہ اسلامیہ'' کھولا جس کے معائنے کے لیے گورنر بنگال کی بیگم، لیڈی فریزر آئیں۔ پٹنہ والوں کے لیے زنانہ مدرسہ کا قیام اور لیڈی فریزر کا اس کے معائنہ کے لیے آنا ایک بڑا واقعہ تھا چنانچہ اس واقعہ کا تذکرہ بہت دنوں تک شہر اور شہر والوں میں ہوتا رہا۔ یہ مدرسہ کئی برس تک چلتا رہا۔ اس مدرسے کو بعد میں بادشاہ نواب رضوی نے بی این آر اسکول کا نام دیا اور اپنی کچھ جائداد اس کے اخراجات کے لیے مختص کر دی۔ مہارانی بیتیاں نے اس اسکول کے لیے عمارت دی، اس وجہ سے یہ اسکول ''بیتیا ہاؤس'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ اسکول ہندو مسلم اشرفیہ کی لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہاں مسلمان لڑکیوں کو اردو اور ہندی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول میں ایک ہوسٹل بھی تھا جس کی نگرانی رشیدالنساء کی بڑی بیٹی نصیب النساء کے حصے میں آئی تھی۔ ان کی نواسی اور سر علی امام کی بیگم، لیڈی انیس امام نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی۔ میری دو پھوپھیوں زاہدالنساء اور شمس النساء کے علاوہ میری ایک چچی زینت افزا حفیظ بیگ نے بھی ''بیتیا ہاؤس'' سے ہی ۳۰ اور ۴۰ کی دہائیوں میں میٹرک کیا تھا۔''(۴)

''رشید النساء بیگم'' کے بعد اردو ناول نگاری کے سرآغاز پر خواتین میں ایک اور نام محمدی بیگم کا نظر آتا ہے جو نامور ادیب وڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں۔ محمدی بیگم (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۰۸ء) نے رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارت کے علاوہ بے شمار علمی و ادبی خدمات سرانجام دیں۔ نشاز یدی لکھتی ہیں کہ:۔

> ''محمدی بیگم نے عورتوں کی اصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ایک طرف تو وہ خواتین کو ''تہذیب نسواں'' کے ذریعہ بیدار کر رہی تھیں۔ دوسری جانب اپنی تحریروں کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور فرسودہ رسموں کو بے نقاب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے خواتین کی زبوں حالی، جہالت اور پس ماندگی کو آئینہ دکھایا۔ انھوں نے 1905 میں ماہوار رسالہ ''مشیر نسواں'' بھی نکالا۔ محمدی بیگم نے مختلف کتابیں تصنیف کیں۔ ''رفیق عروس 1900''میں، ''انمول موتی 1902''میں، ''امتیاز پچیسی 1904'' میں، ''حیات اشرف 1904'' میں، ''سچے موتی 1905''میں، ''آداب ملاقات 1905''میں، ''تاج گیت 1905''میں، ''سگھڑی بیٹی 1905''میں، ''نعمت خانہ 1906'' میں، ''دل پسند کہانیاں 1906''میں ''تاج پھول 1906''میں، ''پان کی گلوری 1907''میں، ''چوہے بلی نامہ 1908'' میں ''خوابِ راحت 1912''میں، ''چندن ہار 1915''میں، ''علی بابا چالیس چور 1915'' میں ''تین بہنوں کی کہانی 1915'' میں شائع ہوئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔ ان سب کتابوں میں خواتین کے لیے نصیحت آموز مضامین ہوتے تھے مثلاً ''رفیق عروس'' میں نئی دلہن کو خانہ داری سکھانے اور سسرال کو خوش رکھنے کے لیے ضروری آداب بتائے گئے ہیں۔ ''چندن ہار'' میں قرض لینے والی خواتین کے لیے ہدایتوں کو دلچسپ قصے کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ''تاج پھول'' بھی بچوں کے لیے ہے جس میں آسان زبان اور دلچسپ انداز میں نصیحت آموز باتیں کی گئی ہیں۔''(۵)

ان کی اکثر تصانیف امور خانہ داری اور اصلاح رسوم پر مبنی ہیں چونکہ اس دور میں سماجی،

سیاسی معاشی و معاشرتی نظام میں بدحالی پھیلی ہوئی تھی،اس لیے خواتین قلمکاروں نے زیادہ تر اصلاحی اقدامات پر زور دیا۔اس سلسلے کی ایک اہم کڑی میں اکبری بیگم کے ناول ''گودڑ کا لال'' بھی شامل ہوجاتا ہے۔ یہ ناول معاشرے کی اصلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ گودڑ کا لال کے تمام کرداران کے اصلاحی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔اکبری بیگم کا مشاہدہ عمیق اور نظر بڑی گہری تھی۔انہوں نے تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت کو واضح کیا۔ان کے یہاں کردار نگاری کی اعلیٰ صلاحیت پائی جاتی ہے چونکہ وہ مقصدی ناول لکھ رہی تھیں لہٰذا وہ کرداروں کی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھتی ہیں اسی لیے ان کے کرداروں کا کوئی عمل ان کے مقصد کے خلاف نہیں ہوتا۔ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالکؔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:-

> ''اس دور کی خواتین ناول نگاروں نے مذہبی اور اخلاقی قدروں کی اہمیت پر زور دیا اور مشرق ومغرب کی اچھی باتوں کو عام کرنے کا جذبہ بھی ابھارا ہے، جو ان کے ناولوں میں جاری وساری نظر آتا ہے۔دراصل مذہب اور اخلاق کی گرفت مردوں کی بہ نسبت خواتین اس میں زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی پاسداری خواتین کے ناولوں میں زیادہ شدت کے ساتھ ملتی ہے۔''(۶)

''گودڑ کا لال'' ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا یہ سات سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ایک نہایت ترقی یافتہ ناول ہے۔اس کی ترقی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں نہ صرف پردے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے بلکہ پہلی بار مسلم لڑکیوں کے لیے تعلیم کا نیا تصوّر ملتا ہے۔

ناول کا موضوع معاشرے کی اصلاح کرنا ہے چونکہ معاشرتی زندگی کی تشکیل میں خواتین کا حصّہ زیادہ ہوتا ہے، مصنّفہ نے اس ناول میں ایسے تمام چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل پر قلم اٹھایا ہے جن سے خواتین کو ہمیشہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ناول کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان تینوں حصّوں میں اس دور کا متوسط اور اعلیٰ درجہ والا متوسط طبقہ کی طرزِ زندگی کی مکمل جھلک کے ساتھ ہندوستانی مسلم معاشرے کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا ذکر ملتا ہے۔ ناول کی ابتدا ایک متوسط خاندان کے گھر کی تصویر کشی سے کی گئی ہے۔جس سے گھر کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔اس گھر میں ثریا جبیں کے علاوہ حسن رضا، مقبول بیگم اور خیر علی ہیں یہ سب سگے بہن

بھائی ہیں اور ان کے ساتھ ان سب کی ماں قمر النساء بیگم بھی ہیں یہی سارے افراد اس ناول کے اہم کردار ہیں باقی دوسرے کردار ضمنی ہیں۔ مصنفہ نے فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے معاشرے کی اصلاح اور سماج کی فلاح و بہبود کے خیر خواہ ہونے کا پورا پورا التزام کیا ہے۔

ثریا جبین اور حسن رضا، یہ دونوں بہن بھائی نہایت شریف طبیعت، سلیقہ منداور سلجھے ہوئے مزاج کے مالک ہیں لیکن ان دونوں کے برعکس اسی گھر میں پرورش پانے والے ان کے بڑے بہن بھائی خیر علی اور مقبول بیگم انتہا درجے کے سُست ہیں اور زندگی جینے کے سلیقوں سے ناواقف نظر آتے ہیں۔

دوسرے باب میں مصنفہ ایک اور گھر سے متعارف کراتی ہیں۔ یوسف رضا اور خیر النساء دونوں بہن بھائی ہیں۔ یوسف رضا نہایت محنتی اور ذہین طالب علم ہے۔ اس کی شادی مقبول بیگم سے ہو جاتی ہے لیکن دونوں کے مزاج میں اختلاف ہونے کی وجہ سے انھیں ازدواجی زندگی کی خوشیاں نصیب نہیں ہو پاتیں۔ یہاں ناول کا پہلا حصّہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی دوسری بیوی محبوب بیگم لکھنؤ کے ایک امیر گھرانے کی نہایت شریف اور سلیقہ مند لڑکی ہے جو یوسف کے بکھرے ہوئے گھر کو سمیٹتی ہے۔ جب مقبول بیگم کو یوسف کی دوسری شادی کی خبر ہوتی ہے تو وہ اس کے پاس پہنچتی ہے اور وہاں اپنی بُری عادتوں کا مظاہرہ شروع کر دیتی ہے، اس کے برعکس محبوب بیگم، مقبول بیگم کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ محبوب بیگم کے کردار کو اس انداز میں پیش کر کے اکبری بیگم یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اچھی تعلیم و تربیت کس طرح انسان کو صبر اور سمجھداری سکھا دیتی ہے۔ مصنفہ اس کردار کو پیش کر کے، تعلیم و تربیت پر زور دینا چاہتی ہیں اگر لڑکیوں کو صحیح تعلیم دی جائے تو وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ مصنفہ نے بے جوڑ شادی کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

اس ناول میں مصنّفہ نے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم اور عمدہ تربیت کی ضرورت، معاشرے میں موجود بُرائیوں مثلاً مختلف المزاج اور بغیر مرضی کی شادی کے نتائج کو پیش کیا ہے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستانی سماج میں پھیلے غلط اور فرسودہ رسم و رواج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

جہاں تک اس ناول کی زبان کا تعلق ہے مصنفہ نے سادہ و سلیس زبان استعمال کی ہے۔ ان کی زبان کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہاں مکالموں کا استعمال بکثرت ہوا ہے یعنی ناول نگار کرداروں پر حاوی نہیں ہے۔ فعال کردار ناول کی فضا سازی میں نہایت ضروری

ہیں جنھیں پیش کرنے میں محمدی بیگم کامیاب ہوئی ہیں۔ ''گودڑ کا لال'' نہ صرف اردو ناول کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے بلکہ آج بھی اس دور کے دوسرے اہم ناول نگاروں کے ناولوں کے مقابلے میں اس کی ادبی اہمیت زیادہ ہے۔محمدی بیگم کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا تھا اگر چہ ان کی ہر تصنیف میں وہی واقعات ہوتے ہیں جو عام گھرانوں میں روزمرہ پیش آتے ہیں۔ان کی زبان دہلی اور لکھنؤ کی بیگمات اور ٹکسالی زبان کے قریب ہوتے ہوئے بھی تصنع وتکلف کے عیب سے بالکل پاک ہے۔

اس دور کی ایک اور اہم ناول نگار عباسی بیگم ہیں۔جن کے دو ناول ''افسانہ نادر جہاں'' ۱۹۱۸ء اور ''زہرہ بیگم'' بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ قصّے بھی اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ ''زہرہ بیگم'' ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جب والدین روپے پیسے کی غرض میں اپنی بیٹی کو کسی غلط جگہ بیاہ دیتے ہیں تو اس کا انجام بڑا تشویشناک ہوتا ہے۔اس ناول میں قدیم اور جدید دو تہذیبوں کی ایسی کشاکش پیش کی گئی ہے جو خوفناک روپ لے لیتی ہے اور آخر کار تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔اگر چہ عباسی بیگم کے ناول ''زہرہ بیگم'' میں بھی اس عہد کے دیگر قصوں کی مانند کہانی کا پورا پس منظر امراء اور جاگیردار طبقے کا ہے، تاہم اس میں اشراف کی اس ذہنیت کو بطورِ خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے یہاں علم و ہنر کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور یہ لوگ محض دولت ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔اس قصّے کے زیادہ تر کردار نئی روشنی کے پرستار ہیں۔مثلاً صغیر، شوکت اور صغیر کے والد ترقی یافتہ ذہن رکھتے ہیں لیکن زہرہ کی ماں پرانے نظریات کی عورت ہے پہلے تو وہ دولت کی ہوس میں زہرہ کو بوڑھے نواب سے بیاہ دیتی ہے اور پھر تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے حالات سنوارنا چاہتی ہے مگر ناکام ہوتی ہے۔

عباسی بیگم کا یہ ناول ایک کامیاب المیہ ہے جو نہایت اثر انگیز ہے اسے پڑھنے کے بعد کوئی ماں اپنی بچّی کا مقدر مال و زر کے لالچ میں داؤ پر لگانے سے قبل سو۱۰۰ مرتبہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔اس ناول کی زبان بڑی رواں، سادہ اور بے ساختہ ہے۔اس کے کردار معاشرے کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے حقیقی ہیں۔ناول کے یہی وہ فنی رُموز ہیں جنھیں عباسی بیگم نے کامیابی کے ساتھ ناول کی سطح پر ابھارا ہے اور ناول نگاری میں انفرادیت کی حامل ہوئی ہیں۔

اس زمانے کی ایک اور خاتون ناول نگار ''طیبہ بیگم'' ہیں۔یہ نواب عماد الملک کی صاحبزادی

تھیں۔عربی،فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی قدرت رکھتی تھیں ایک باعمل اور متحرک شخصیت تھیں سماجی کاموں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی تھیں چنانچہ آپ نے، حیدرآباد، دکن میں لیڈیز ایسوسی ایشن اور انجمنِ خواتین اسلام کی بنیاد رکھی۔بیشمار عورتوں کو دستکاری،خانہ داری سکھانے کے علاوہ ابتدائی تعلیم سے بھی آراستہ کروایا۔انھوں نے علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کیا۔مزید برآں طیبہ بیگم اپنی خداداد قابلیت کی بناپر لیڈیز کانفرنس کی صدر بھی منتخب ہوئیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں جاگیردارانہ گھرانے،عورتوں کی اصلاح،سماج میں عورت کے ساتھ انسانی دوستی اپنانے اور مرتبہ کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی ہے جن میں ''حشمت النساء'' کافی مشہور ہوا ہے۔اس ناول میں بھی عورتوں کو اپنی خانگی زندگی کو بہتر بنانے اور تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

طیبہ بیگم کے ناول ''حشمت النساء'' اور ''نوری بیگم'' قابلِ ذکر ہیں۔ان ناولوں میں انیسویں صدیں کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے حیدرآباد کی معاشرتی تصویر کشی کی گئی ہے۔تعلیم نسواں اس ناول کا خاص موضوع ہے،لیکن اسی کے ساتھ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر بھی دکھائی گئی ہے۔جیت نئی روشنی کی ہوتی ہے اور پُرانے توہمات اور تعصّبات کو چھوڑ کر معاشرہ جدید نظریات سے روبرو ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔رشید النساء اور محمد بیگم کی طرح طیبہ بیگم بھی شادی بیاہ کی رسومات اور جزئیات کو جذباتیت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالکؔ لکھتے ہیں کہ:-

> ''اس عہد کی خواتین کے ناولوں میں وہ رسم ورواج بھی زندہ ہیں جو فرسودگی اور رومان پروری کے باوجود اپنے اندر کشش رکھتے ہیں اور ان میں ایک نشاط انگیز حسن اب بھی باقی ہے۔صدیوں کی پُرانی تہذیبی روایات اور بیگموں کے جذباتی اور فکری میلانات کا قدیم سرمایہ موجود ہے۔موجودہ دور میں بعض رسم ورواج کو چھوڑ دینے کے بعد بھی اس میں زندگی کی پوری دھڑکن سنائی دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان تمام روایات کا بغور مشاہدہ کر رہے ہیں۔شادی بیاہ سے متعلق رسموں کا تذکرہ،خواتین کے قصے کہانیوں اور ناولوں میں بڑی دلستگی اور رچاؤ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔بعض خواتین نے اپنے ناولوں میں معاشرتی زندگی کے روایتی طور طریقے،

ماضی کے دلکش نقوش اور اس کی یادگاروں کو خلوص اور دیانت دارانہ انہماک کے
ساتھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔"(۷)

اردو ناول کی تاریخ میں نذر سجاد حیدر کے ذکر کے بغیر اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں کا بیان نامکمل رہے گا۔ آپ نے تقریباً دس ناول اور دو سوافسانے لکھے۔ "اختر النساء" "آہ مظلومان" ۱۹۱۰ء "جاں باز" ۱۹۳۵ء "نجمہ" اور "حرماں نصیب" ۱۹۳۸ء میں لکھیں جو زیادہ مقبول ہوئے۔ ناول "حرماں نصیب" فیروزہ کی ناکام محبت پر مبنی قصہ ہے۔ جو ان کے تمام ناولوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہے۔ قصے کو کہانی میں اس مہارت سے بیان کیا گیا ہے کہ قصہ کی تہ داری کے باوجود کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ کہانی یوں ہے کہ فیروزہ کے دادا نے جاپان سے ایرانی خاتون سے شادی کر لی تھی وہ خود تو ہندوستان ہی میں مقیم رہے البتہ فیروزہ کے والدین جاپان چلے گئے۔ یہ لوگ بہت امیر تھے۔ ایک مرتبہ دادا اپنی پوتی فیروزہ اور اپنے پوتے فیروزہ کے ساتھ گرمیوں کی چھوٹی میں مسوری جاتے ہیں اور اسی درمیان دہرہ دون کے ایک رئیس زادے ظفر سے فیروزہ کی ملاقات ہوتی ہے اور اسے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں بھائی بہن آگے کی تعلیم حاصل کے لیے مسوری میں قیام کا ارادہ کرتے ہیں چنانچہ ان کے دادا ان کے رہنے کے لیے ایک بنگلہ خرید دیتے ہیں اور یہاں فیروزہ اسکول سے کالج تک کی تعلیم حاصل کرتی ہے اور ظفر پانچ سال کے لیے انجیر نگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ولایت چلا جاتا ہے۔ اسی درمیان فروز اچانک بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔ اس کے دادا یہ سدما برداشت نہیں کر پاتے اور ان کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔ اسی دوران جب ظفر ولایت سے واپس آتا ہے اور فیروزہ سے ملاقات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ فیروزہ اپنے بھائی کے غم میں ڈوبی ہوئی اس کی قبر کے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی مایوسی کی انتہاں تب پار ہوتی ہے جب وہ خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر ظفر عین موقع پر پہنچ کر اس کو بچا لیتا ہے۔ فیروزہ کی اس حرکت سے والدین پریشان ہو جاتے ہیں اور جاپان چھوڑ کر ممبئی آ جاتے ہیں اور وہ اسے وہاں بلاتے ہے لیکن وہ جانا نہیں چاہتی اور ظفر سے شادی کرنے کے لیے بھی منا کر دیتی ہے۔ اگلے دن ظفر اور اس کے بھائی صفدر نے اسی جھونپڑی میں ایک اور مرد کو دیکھا جو فیروزہ سے بڑا بے تکلف تھا صفدر نے شبہ ظاہر کیا کہ فیروزہ بے وفا ہے اس لیے اسے بھول جانا چاہیے۔ دوسرے ہی دن فیروزہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ مایوس و نامراد ظفر نے والدین کے زور ڈالنے پر دوسری جگہ شادی کر لیتا ہے۔ چند برس بعد جب اس کے دو

بچے ہوئے اور اپنے خاندان کے ہمراہ مسوری میں قیام پذیر ہوا تو اس کی فیروزہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو اپنے بھائی کی قبر پر تلاوت کر رہی تھی۔ فیروزہ نے ظفر کو بتایا کہ اس کے ماں باپ اگر چہ اسحاق کو ہاں کہہ چکے ہیں مگر وہ آج بھی صرف دو ہستیوں سے پیار کرتی ہے ایک اس کا پیارا دوست ظفر جو اب شادی شدہ ہے اور کسی دوسری عورت کی امانت ہے۔ دوسرا اس کا پیارا بھائی فیروز جو مر چکا ہے۔ اسحاق سے جان چھڑانے کے لیے وہ بمبئی سے ڈاکٹری کرنے کے بہانے امریکہ چلی گئی تھی۔ اب پانچ سال بعد واپس آئی ہے اور سیدھے مسوری پہنچی ہے۔ اسحاق کو اس نے صاف صاف جواب دے دیا ہے اور اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بھائی کی آخری آرام گاہ کے قریب ایک ہسپتال تعمیر کر کے غریبوں کا مفت علاج کرے گی تا کہ فیروز کی روح کو ثواب پہنچے۔ ظفر کو انہیں ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ چند برس پیشتر فیروزہ کی کوٹھری میں نظر آنے والا مرد اس کا سگا چچا تھا جو اسے بمبئی سے لینے وہاں پہنچا۔ ظفر کا دل پچھتاوے اور بیوی بچوں کی زنجیروں کے بوجھ سے تڑپ اٹھا مگر فیروزہ نے اس سے کہا کہ ہم دونوں کی قسمت میں یہی لکھا تھا اس لیے اب انہیں حوصلے اور ہمت سے اپنی زندگی گزر بسر کرنی چاہئے۔

فیروزہ کے روپ میں نذر سجاد حیدر نے ایک تعلیم یافتہ با حوصلہ اور خود اعتماد لڑکی کو پیش کیا ہے جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔ وہ اتنی خود مختار ہے کہ بھائی کی وفات کے بعد ایک انجان جگہ پناہ لیتی ہے لیکن فروزہ کی یہ خود اعتمادی اس کی جذباتیت میں دب کر رہ جاتی ہے وہ باشعور تعلیم یافتہ لڑکی ہے لیکن بھائی کی وفات کے صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی یہاں تک کہ وہ ظفر سے بھی بیگانگی اختیار کر لیتی ہے جو اسے اس دکھ کے ساتھ اپنانے اور سہارا دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے ایک بہن کی آئیڈیل محبت کو پیش کیا ہے جو اپنی پوری زندگی بھائی کی محبت پر قربان کر دیتی ہے۔ اسی لیے اس ناول کی کہانی زندگی کے قریب اور حقیقی سی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں۔ جب ظفر اور فیروزہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہوتے ہیں:۔

> ''ظفر کچھ نہ بولا۔ فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سینے وفور رنج و غم سے پھٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کیے رہے۔ مگر رکشہ کا بڑھنا تھا کہ خونِ دل ظفر کی آنکھوں میں امنڈ آیا۔ ادھر فیروزہ گھر

جا کر ایک صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔''(۸)

ابتدائی ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔نذر سجاد حیدر کا پورا گھرانہ تعلیم یافتہ تھا۔ان کے شوہر سید سجاد حیدر یلدرم اردو ادب کے مشہور افسانہ نگار تھے اور ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک نامور ہستی ہیں۔نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا موضوع وقت کے تقاضوں کی مناسبت سے نئے رجحانات کو اپنانا تھا تا کہ زندگی اچھی طریقے سے گزاری جا سکے انہوں نے اس طبقے کی عکاسی کی جس میں لڑکیاں پردے میں رہتی تھیں نذر سجاد ہندوستانی مسلمانوں میں ان اولین خاتون رہنماؤں میں سے تھیں جنہوں نے بے زبان عورتوں کی حمایت کے لیے آواز اٹھائی۔

حجاب امتیاز علی رومانی رجحان کی نمائندہ فنکار ہیں وہ اپنے دور کی نہایت ترقی یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں۔ان کی ترقی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کی پہلی مسلمان خاتون ہوا باز ہیں انہوں نے ۱۹۳۶ء میں لاہور فلائنگ کلب سے پائلیٹ کا لائسنس حاصل کیا۔رسالہ ''تہذیب نسواں'' ۱۹۳۶ء میں حجاب کے اس کارنامے کا کافی چرچا رہا تھا۔حجاب نے بہت کم عمر میں لکھنا شروع کیا ان کا پہلا ناولٹ ''میری ناتمام محبت'' جو رسالہ ''نیرنگِ خیال'' میں شائع ہوا اور کتابی شکل میں بعد میں چھپا اس کے بعد ان کا دوسرا ناولٹ ''ظالم محبت'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔حجاب امتیاز علی سے تقریباً پچیس تیس برس قبل خواتین کی ایک بڑی تعداد ناول نگاری کے میداں میں قدم رکھ چکی تھی۔اس دور کا عام رجحان ادب کو معاشرے کی اصلاح کے لیے بطور آلہ استعمال کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ خواتین ناول نگاروں نے بھی اپنے فکشن کو طبقۂ نسواں کی اصلاح کے لیے استعمال کیا۔ان کا اصل خطاب خواتین سے ہی تھا۔اس دور میں جس قدر ناول لکھے گئے بنیادی طور پر معاشرہ میں خواتین کی سماجی، تعلیمی، معاشی اور مذہبی اصلاح کے لیے ہی لکھے گئے۔اس پس منظر میں حجاب امتیاز نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی اور اپنے ناولوں کے لیے عشق و محبت کے موضوع کا انتخاب کیا۔ان کے یہاں ایک شدید قسم کی رومانی فضا ملتی ہے لیکن اس تخیلی فضا کو پیش کرتے ہوئے وہ معاشرہ کے مسائل سے بیگانہ نہیں ہوتیں۔حجاب امتیاز علی کا ناول ''ظالم محبت'' کا موضوع عشق ہے ساتھ ہی اس ناول میں معاشرہ کی اقدار اور شادی بیاہ کے مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس ناول کے اہم کردار دادی زبیدہ، چچالوث، جسوتی، منصور اور منیر ہیں۔ قصہ روحی کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔ ناول کی کہانی یوں ہے کہ جسوتی کی منگنی منیر سے ہو جاتی ہے منیر اس کو بہت چاہتا ہے مگر جسوتی منیر کو پسند نہیں کرتی بلکہ وہ منیر کے دوست منصور کو پسند کرتی ہے اور محبت کا اظہار خود آگے چل کر منصور سے کرتی ہے۔ منصور بھی جسوتی کے لیے محبت کا جذبہ رکھتا ہے لیکن اس کو احساس ہے کہ وہ اس کے دوست کی منگیتر ہے اسی لیے اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے اور جسوتی کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر جسوتی اس بات کو سمجھنے کو تیار نہیں۔ ناول میں اس ثالث محبت کی وجہ سے کافی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ منصور جب جسوتی کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے تو وہ وہاں سے چلی جاتی ہے اس کے جانے کے بعد منصور بے حد اداس اور پریشان ہو جاتا ہے لیکن وہ بھی مجبور ہے۔ جسوتی اپنی محبت کو چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ منصور اور روحی کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے اور منصور کے لیے وہ اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتی ہے، جب منصور کا گھوڑا غار میں گر جاتا ہے تو وہ اس کے پیچھے غار میں کود جاتی ہے پھر منصور اور جسوتی کی ملاقات پر یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے عورت کے کردار کو اس طرح سے پیش کیا ہے جس طرح سے وہ دیکھنا چاہتی ہیں اس لیے انھوں نے معاشرے کی بدلتی قدروں کو ظاہر کرنے کے لیے تین قسم کے کردار پیش کیے ہیں ایک تو وہ کردار جو پرانی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے خاندانی اصول و روایت کی وجہ سے سختی سے پیش آتے ہیں۔ دوسرے درمیانی سوچ کے حامل لوگ جو نئی نسل اور پرانی نسل دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ پرانی نسل کی نمائندگی بیگم زبیدہ کرتی ہیں جبکہ چچالوث دو نسلوں کے درمیان فرق کو سمجھتے ہیں۔ نئی نسل کے نمائندہ کرداروں میں جسوتی اور روحی کے کردار ملتے ہیں۔ جسوتی سماج کے روایتی اصولوں پر زندگی گزارنے کی بجائے اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہے اور وہ اپنے دل و دماغ کی ہی بات مانتی ہے۔

حجابؔ کی زبان نرم و نازک اور اسلوب شاعرانہ ہے چونکہ ناول کا موضوع حسن و عشق ہے لہٰذا ناول نگار نے موضوع کے اعتبار سے ہی زبان و اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ جس میں لطافت و شیرینی اور سوز و گداز کی چاشنی ہے۔ حجابؔ کے ناولوں کی ایک اہم فنی خصوصیت مکالموں کا استعمال ہے۔ کہانی بیان کرتے ہوئے وہ بار بار مکالموں کا سہارا لیتی ہیں ان کے مکالمے اکثر

چھوٹے چھوٹے اور برمحل ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف کہانی کے ارتقاء میں حصّہ لیتے ہیں بلکہ کرداروں کے مزاج اور ان کی ذہنی وقلبی کیفیات کے ترجمان بھی ہوتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی نے رومانی ناولوں اور افسانوں کے علاوہ کچھ نفسیاتی مضامین، افسانے اور ناول بھی لکھے۔ جس میں ''اندھیرا خواب'' ان کا مشہور ناول ہے جو رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوا۔ ان کی نفسیات سے گہری دلچسپی کے سبب، غیر شعوری طور پر ہی سہی ان کے رومانی ناولوں میں بھی کچھ نفسیاتی نکتے ملتے ہیں۔ یہ نکتے پیچیدہ نفسیات کو پیش نہیں کرتے بلکہ عام نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد خواتین ناول نگاروں میں ایک ایسے نئے رجحان کا آغاز ہوا جس میں حقیقت و صداقت، غور وفکر، نفسیاتی پیچ وخم اور حقیقت پسندانہ رویہ ملتا ہے۔ ان کے مشاہدات نے چہار دیواری سے نکل کر معاشرتی زندگی کے گوناگوں اور سنجیدہ مسائل کو اپنی گرفت میں لے لیا انہوں نے تخئیل کی بلند پروازی، حسن بیان اور غور وفکر کی باریکیوں کو نہ صرف فن کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے بلکہ گہرائی و گیرائی کے ساتھ اعلیٰ فن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں ان خواتین میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین وغیرہ کے نام قابلِ تعریف ہیں۔ وقار عظیم ان خواتین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ''اس دور میں ناول نگار خواتین نے اپنی نظر میں وسعت پیدا کر کے کہانیوں کے پس منظر میں زیادہ پھیلاؤ پیدا کیا ہے۔ ان کے مشاہدے اور تخئیل نے گھر کی زندگی سے باہر قدم نکال کر معاشرتی زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاست کے اثرات اور فرد اور جماعت کی زندگی کے قریبی تعلق کا احاطہ کر کے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ اس دور کے ناولوں نے فنی حیثیت سے ایک ایسا رتبہ حاصل کیا ہے کہ ان کے کارنامے مرد ناول نگاروں کے لیے رشک کا باعث بنے ہیں۔'' (۹)

اس دور میں سب سے اہم مقام عصمت چغتائی کا ہے۔ عصمت چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہوا۔ اس دوران اور اس سے چند برس پہلے اردو ادب میں کچھ اور اہم نتیجہ خیز تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ رومانیت کی دھند رفتہ رفتہ چھٹتی جا رہی تھی اور حقیقت نگاری کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔ جدید تعلیم اور مغرب کے اثر سے کچھ لوگوں میں زندگی سے نظر ملانے کی جُرات

پیدا ہوئی۔ بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور خاص طور سے عصمت چغتائی نے اپنی تخلیقات میں جنسی حقیقت نگاری کو صحت مند راہوں سے گزارا ہے۔اس بارے میں فرزانہ نسیم لکھتی ہیں کہ:-

''عصمت نے جنسیات بڑی بے باکی سے پیش کیا تا کہ پردے کے اندر پیدا ہونے والے بے شمار جرائم لوگوں کے سامنے آسکیں اور وہ بات کو محسوس کریں کہ زندگی کے گھناؤنے پن کو روایتی اخلاق کے پردوں میں چھپائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جنس کی ضرورت کو مذہب سے الگ ہٹ کر سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔''(۱۰)

ساتھ ہی انہوں نے مسلم متوسط طبقے کی پردہ نشین خواتین اور لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے بیشتر مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ دراصل عصمت چغتائی مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی ان گنت برائیوں، کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہیں اور اپنے ناولوں کے کرداروں کو حقیقی صورت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہیں۔ عصمت نے حقیقت کی تلاش وجستجو صرف ''زندگی کیا ہے'' کہہ کر نہیں کی ہے بلکہ کرداروں کی اندرونی ذات میں ڈوب کر یہ دیکھا ہے کہ زندگی ایسی کیوں ہے یہی وجہ ہے کہ عصمت حقیقت پر پڑے پردے کو نوچ کر اس کی اصل ہیئت کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح عصمت معاشرے کے رجحانات کو غور وفکر کے نئے نگارخانوں میں سجا کر تلخ حقائق کو واضح کرتی ہیں اور متوسط طبقے کے مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کی ذہنی اور جنسی ناآسودگی اور اس کی الجھنوں کو کھل کر پیش کرتی ہیں۔ اس ضمن میں خود عصمت کا کہنا ہے-:

''دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم لڑکیوں کو کہا جاتا تھا ''بھاگو تم لوگ'' میں چھپ کے پلنگ کے نیچے گھُس کے کہیں سے ان کی باتیں سن لیا کرتی تھی، جس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیبیوں کے متعلق باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میری تخلیق اس گھُٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے، فوٹو گرافی ہے۔''(۱۱)

عصمت چغتائی کے فن کا عروج یہی ہے کہ ماحول کی تصویر کو انھوں نے اس طرح پیش

کیا کہ گھر کی چہار دیواری کے بند ماحول میں پروان چڑھتی لڑکیوں، عورتوں اور نوجوانوں کے مسائل سامنے آ گئے اور ان پر کھُل کر بحث ومباحث ہوئے لیکن عصمتؔ نے جنس کو لذت سے سرشار ہوکر پیش نہیں کیا، بلکہ جنسی لذت یا جنسی ضرورت کو وہ ایک صحت مند ماحول کے پروان چڑھنے میں معاون سمجھتی ہیں جسے ہندوستانی معاشرہ میں شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے جس کے سبب نوجوانوں کی نفسیات اور ذہنی نشوونما میں اور پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ عصمتؔ نے سماج کے اس اندھیرے غار سے پردا اٹھایا یہی وجہ ہے کہ عصمتؔ کے یہاں صحت مند زندگی کا تصور ملتا ہے۔ جو ان کے پورے فکشن میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انکے ناولوں میں ''ضدی'' ''ٹیڑھی لکیر'' ''معصومہ'' ''سودائی'' ''عجیب آدمی'' ''دل کی دنیا'' اور ''ایک قطرہ خون'' شامل ہے۔ ''ضدی'' اور ''ٹیڑھی لکیر'' کو چھوڑ کر ان کے سبھی ناول آزادی کے بعد شائع ہوئے۔ بیشتر خواتین ناول نگاروں نے تقسیم وطن کے حادثے کو کسی نہ کسی طور پر اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے لیکن عصمتؔ نے کوئی ایسا ناول نہیں لکھا جو تقسیم وطن کے موضوع پر ہو حالانکہ کہ آزادی سے تین سال قبل ان کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ۱۹۴۴ء میں منظرِ عام پر آ چکا تھا۔

ٹیڑھی لکیر ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں ''شمن'' کی نفسیات کے ارتقاء کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ شمن کی نفسیات ایک نارمل لڑکی کی نفسیات نہیں ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوئی ہے وہاں کے ماحول نے بچپن سے ہی اس کے مزاج میں کجی پیدا کر دی ہے۔ یہ کجی عمر کے کسی مرحلے پر جا کر ختم نہیں ہوتی بلکہ دن بہ دن اس کجی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناول نگار نے شمن کے روزمرّہ کے معاملات سے اس کجی کے مظاہر پیش کیے ہیں اور اس کے محرکات کی جستجو کی ہے جو داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ خارجی محرکات میں وہ مخصوص معاشرہ ہے جس میں شمن کی نفسیات تشکیل پائی ہے۔ شمن ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ شمن کے علاوہ بہت سے ضمنی کردار بھی ہیں۔ جو منفرد خصوصیت رکھتے ہوئے بھی بنیادی طور پر شمن کے کردار کی تشکیل میں مدد کرتے نظر آتے ہیں۔ عصمتؔ نے شمن کے بچپن اور جوانی کی نفسیات، جنسی خواہشات اور ذہنی کشمکش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار شمشاد بیگم عرف شمن کا ہے جس کی شخصیت اپنے والدین کی بے توجہی کے سبب ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ بقول عظیم الشان صدیقی:-

''شمن کی نفسیات اور شخصیت کے ٹیڑھے پن میں اگر چہ خارجی اور انفرادی عناصر بھی شامل ہیں لیکن وہ عورت کی حقیقی نفسیات کا جیتا جاگتا پیکر بھی ہے۔ البتہ اس کی بے باکی، سرکشی اور بغاوت میں اس کے گھریلو ماحول، ماں باپ کی بے اعتنائی اور تعلیم کو بھی دخل ہے۔''(۱۲)

مصنفہ نے اس ناول کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں شمن کا بچپن اور گھریلوں زندگی ہے۔ دوسرے حصہّ میں جوانی کا ابتدائی دور اور اسکول و بورڈنگ کی زندگی ہے۔ تیسرے حصہ میں شمن کی خارجی دنیا سے ٹکراؤ کو بیان کیا گیا ہے۔

شمن اپنے والدین کی دسویں اولاد ہے جو کہ ان کی محبت اور نگرانی سے محروم رہتی ہے۔ اس کی ماں بچے پیدا کرنے اور والد بیوی میں دلچسپی لیے ہوتا ہے۔ بڑی بہن منجھو اسے پالتی ہے لیکن منجھو کی شادی کے بعد شمن پھر اکیلی ہو جاتی ہے پھر جب یہی بڑی بہن بیوہ ہو کر گھر آتی ہے اور اپنی بیٹی نوری کو پیار اور شمن کو نظر انداز کرتی ہے تو شمن کو بڑا عجیب لگتا ہے۔ اس کی سوچ میں زبردست نفسیاتی پیچیدگی رونما ہونے لگتی ہے اور یہ انھیں کیفیات سے الجھتی سلجھتی جب اسکول کالج میں تعلیم حاصل کرنے جاتی ہے تو اس کی زندگی پر گزشتہ حالات کا اثر پڑنا فطری عمل ہوتا ہے اور یہ اثر بورڈنگ میں پڑھتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اطراف میں کئی سماجی پابندیاں بھی دیکھتی ہے مثلاً۔۔۔ پردے کی قید، لڑکیوں کو آزادی کی ممانعت، ان کی شادی کا مسئلہ، معاشی اور جنسی مسائل ان سب کا اس کی شخصیت پر گہرا اثر کرتا ہے۔ وہ تعلیم حاصل کر کے گھر لوٹتی ہے لیکن یہاں خود کو تنہا پا کر اسکول میں نوکری کر لیتی ہے۔ یہاں بھی وہ ایک نئے ماحول سے واقف ہوتی ہے اسی دوران وہ ایک لڑکی کو گود بھی لے لیتی ہے اس کے بعد ایک ترقی پسند نوجوان اس کی زندگی میں آتا ہے۔ عشق پروان بھی نہیں چڑھنے پاتا کہ اسے پتا چلتا ہے وہ شادی شدہ ہے۔ آخر میں وہ ایک امریکن سے شادی کر لیتی ہے مگر اس سے بھی اس کا نبھا نہیں ہوتا۔ دونوں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور وہ تنگ آ کر لشکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی درمیان شمن کو پتا چلتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور شوہر کے انتظار پر یہ ناول اختتام کے عروج کو پہنچتا ہے۔

گنگو بائی

عصمت چغتائی اپنے دوسرے ناول ''معصومہ'' میں یہ بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ مردانہ سماج میں عورت جسم فروشی پر کیسے مجبور ہو جاتی ہے۔ترقی یافتہ شہروں میں کس طرح عورت کا استحصال اور استعمال ہوتا ہے اس کا تجزیہ مصنفہ نے اپنے ناول میں بے باکی سے کیا ہے۔ وہ سماج میں ایسے حقائق سے پردہ اٹھانا چاہتی ہیں جس کی آڑھ میں لوگ شرافت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ مصنفہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ بدصورت اور گھناؤنے حقائق کو ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ اسی بے باکانہ انداز میں پیش کرتی ہیں جس طرح ان کا اصلی روپ سماج میں اپنا گھناؤنا کھیل کھیلتا ہے۔جس کی جیتی جاگتی عمدہ مثال گنگو بائی فلم ہے۔

معصومہ حیدرآباد کے جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جس کا باپ رضا کاروں کی فوج کا رکن ہے۔ پولیس ایکشن میں حالات بگڑتے دیکھ کر روپیہ پیسہ اور زیورات لے کر بیٹوں کے ساتھ پاکستان بھاگ جاتا ہے۔معصومہ کی ماں تین بیٹیوں اور ایک چھوٹے بیٹے کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے پھر اس خیال سے بمبئی آجاتی ہے کہ یہاں ہر شئے کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔وہ اپنے جان پہچان کے لوگوں کے پاس رہتی ہے۔ دو سال کسی نہ کسی طرح گزرتے ہیں پھر ضروریات زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ برتن فروخت کرنے حیدرآباد جاتی ہے اور جب ہفتہ بھر بعد لوٹتی ہے تو ماحول بدل جاتا ہے۔ اس کے رشتہ دار احسان بھائی بڑی لڑکی معصومہ کو تحفوں اور کپڑوں سے لاد دیتے ہیں۔بیگم صاحبہ کو بعد میں بتا چلتا ہے کہ یہ تحفے احسان بھائی کے دوست کے سیٹھ احمد بھائی نے دیئے ہیں جو احسان صاحب کے فائنانسر ہیں۔رفتہ رفتہ احسان بھائی بیگم صاحبہ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ احمد بھائی اپنے فائنانسر کو لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔وہ بیگم صاحبہ کو بھی مجبور کرتے ہیں۔تب وہ معصومہ کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔وہ معصومہ کو یہ سمجھاتی ہیں کہ گھریلوں ضروریات کے لیے یہ سودا ضروری ہے اور معصومہ سمجھ جاتی ہے۔ پہلے احمد بھائی پھر سورج مل اس کے بعد راجہ صاحب، کرنل صاحب کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے اس کے بعد نیلوفر معصومہ بن کر باضابطہ اپنے فلیٹ میں پیشہ کرنے لگتی ہے۔گھر کی خوشحالی نیلوفر کی وجہ سے ہے وہ گھر کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے۔اپنی بہن زبیدہ کی شادی دھوم

دھام سے کرتی ہے پھر بھی اس کا خاوند اس کو طعنے دیتا ہے کہ وہ رنڈی کی بہن ہے۔ نیلوفر اس کا منہ تحفوں سے بھر دیتی ہے۔ حلیمہ کی شادی معمولی شکل وصورت کی وجہ سے نہیں ہوتی پر وہ شادی نہ ہونے کے لیے نیلوفر کو ذمہ دار سمجھتی ہے۔ اسکے بھائی کو لوگ پیشہ ور عورت کا بھائی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اس پر سلیم کو غصہ آتا ہے تو وہ سلیم کو بھی تحفے دے کر منا لیتی ہے، اس طرح سب اس کا استحصال کرتے ہیں اس کے پیسے پر عیش کرتے ہیں اس کی زندگی تباہ کرتے ہیں لیکن کوئی اس کے درد و کرب کو محسوس نہیں کرتا بلکہ سب اسے نفرت کی ہی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن وہ مرد اور ماں جنہوں نے نیلوفر کو اس گندگی میں دھکیلا۔ نہ تو کوئی ان کا نام لیتا ہے اور نہ ہی کوئی ان سے نفرت کرتا ہے بلکہ سماج انہیں عزت دیتا ہے کیونکہ وہ لوگ بڑے بڑے عہدے پر فائز جو ہیں۔ عصمتؔ نے مردانہ سماج کے دوغلے پن کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ناول کے تمام واقعات کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا ہے کیوں کہ وہ خود ایک عورت ہے۔ جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ پدری معاشرے میں جائز و ناجائز کا فرق ہی نہیں ہے تو عصمتؔ کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ فنکار کی فکر کا بنیادی عُنصر بھی اسی ناانصافی کے بطن سے پنپتا ہے۔ عصمتؔ واقعی بڑی فنکار تھیں جن کی فکر آج بھی انسانی سماج کے ہر موڑ پر ہمیں دکھائی دیتی ہے جو ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

معصومہ کے جسم فروش بننے میں اس زوال آمادہ نوابی معاشرے کا بہت بڑا ہاتھ تھا جو عیاشی کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور یہ سب کچھ مذہب اور شرافت کی آڑ میں فروغ پا رہا تھا معصومہ عیاشی اور بدفعلی میں پوری طرح ملوث ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں داخلی کرب سے کسمساتی رہتی تھی کیونکہ وہ ہر طرح سے ایک مشرقی لڑکی تھی۔ سہیلیوں کی خوش گپیاں، بہن کی ہمدردی، شوہر کی ناز برداری، بیوی کا تصور، باعزت زندگی، ماں کی عظمت اور اولاد کی خوشیاں یہی وہ خواب تھے جو اس نے بھی دیکھے تھے لیکن اس کے تمام خواب دولت مند لوگوں کی جنسی ہوس کا شکار ہو کر بکھر جاتے ہیں اور وہ بمبئی کے سرمایہ دارانہ نظام میں پس کر ایک جسم بیچنے والی طوائف بنا دی جاتی ھے۔ جس کے داخلیت کے زخموں پر کوئی مرہم تک لگانے والا نہیں ہوتا۔ عورت کے استحصال کا یہ گھناؤنا روپ عصمتؔ نے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے جو ترقی پسند کے دور میں حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

''سودائی'' عصمت چغتائی کا ایک کمرشیل ناول ہے جس کی عکاسی فلمی انداز میں کی گئی ہے۔اس کا فلمی نام ''بزدل'' ہے۔عصمتؔ کا ایک اور ناول ''عجیب آدمی'' میں ایک فلم ڈائریکٹر کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔فلمی ادب چونکہ پاپولر لٹریچر کی صنف میں شمار ہوتا ھے اس لیے اس کی ادبی فضا سنجیدہ ادب سے زرا علیحدہ ہوتی ھے۔کہانی کو فلم سازی کی مناسبت سے توڑا مروڑا جاتا ہے۔اس لیے اس کا تجزیہ یہاں مناسب نہیں ہے۔دراصل معصومہ اور ٹیڑھی لکیر کے بعد عصمتؔ کے کسی ناول کا ذکر آتا ھے تو وہ ''دل کی دنیا'' ہے۔یہ ناول سماجی مسائل پر مبنی ناول ہے۔ اس میں خاندانی اور سماج کی بے بنیاد اور غلط رسموں میں جکڑی ہوئی ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو شوہر کی بے التفاتی کا شکار ہے۔ناول کی ہیروئن قدسیہ کی دکھی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف واقعات کو ترتیب دے کر ناول کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔اس ناول میں قدسیہ کی الم انگیز داستان ایک علامت ہے جس کے ذریعے عصمتؔ نے مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی معاشرت، اخلاقی، مذہبی عقائد اور روایت پرستی پر بھرپور چوٹ کی ہے۔اس کے علاوہ بڑی بوڑھیوں کے بے شمار توہمات رجعت پسندانہ رویہ اور مذہبی روایات کی شدید وابستگی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان تمام ناولوں کے سماجی موضوعات سے ہٹ کر عصمتؔ چغتائی نے ایک تاریخی ناول ''ایک قطرہ خون'' لکھا۔اس ناول کو انہوں نے انیسؔ کے مرثیوں کو نثری روپ میں ڈھال کر ناول کی شکل میں پیش کیا ہے جس کا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔اس لیے یہ ناول ادبی حیثیت اختیار کرنے کے بجائے مذہبی حیثیت کا حامل ہو کر رہ گیا۔

عصمتؔ چغتائی کے متذکرہ بالا تحریر کردہ کئی ناولوں میں جو حیثیت ''ٹیڑھی لکیر'' کو حاصل ہوئی وہ ان کے کسی اور ناول کو حاصل نہیں ہو سکی۔''ایک قطرہ خون'' کے علاوہ تقریباً سبھی تخلیقات سماجی دکھ، درد اور ستم ظریفی کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔افسانوں کے علاوہ ان کے ناول اور ناولٹ شائع ہوئے ان کا پہلا ناول ۱۹۲۱ء ''تلاشِ بہاراں'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ جس کو کافی شہرت حاصل ہوئی اس ناول کی پوری فضا اس دور میں لکھے جانے والے اکثر ناولوں کی طرح آزادی اور تقسیمِ وطن ہے۔یہ ناول آزادی سے کچھ پہلے کے زمانے کو پیش کرتا ہے اور تقسیم

سے پہلے کے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب وتمدن کی عکاسی بھی کرتا ہے۔''تلاشِ بہاراں'' میں آزادی سے قبل کے اس عہد کو بیان کیا گیا ہے جب ہندوستان میں سماج اور سیاسی بیداری کی لہریں چاروں طرف پھیل رہی تھیں اور حصولِ آزادی کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے جد و جہد اور بیڑیاں ٹوٹنے کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں لیکن سب سے زیادہ جمیلہ ہاشمی نے جس چیز پر زور دیا ہے وہ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت اور اس کے استحصال کی دردناک کہانی ہے۔ناول کا کوئی کردار ایسا نہیں ہے جو جنگِ آزادی کی جدوجہد میں کسی طرح شریک نہ ہو۔ناول کا کینوس اس مصنفہ کے وسیع تجربات اور روشن خیالی کا پورا ثبوت پیش کرتا ہے۔جمیلہ ہاشمی نے تقسیم سے قبل برصغیر کے دانشور طبقے کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی عکاسی اپنے کرداروں کے وسیلے سے کی ہے۔اس ناول کے تمام کردار غیر مسلم ہیں۔مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر کا ہے۔مذہب وملت کی تفریق کے بغیر اس کردار کے خیالات اور قول وفعل بہت حد تک بلند و معیاری ہیں۔ناول کے اس قصّے میں فرقہ وارانہ فسادات کی عکاسی کی گئی ہے۔کنول کماری ٹھاکر اپنے کالج کی مسلم طالبات کی عصمت وآبرو بچاتے ہوئے اپنی جان دے دیتی ہے۔اس اعتبار سے''تلاش بہاراں'' میں تقسیمِ وطن کا سانحہ ایک دردناک المیے کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔جمیلہ ہاشمی تقسیم وطن کو غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویہ قرار دیتی ہیں اور اس کی ذمہ داری ہندو مسلم فرقہ پرستی پر نہیں تھوپتیں بلکہ ہندوستانی لوگوں میں نفرت کا زہر پھیلانے کی تمام ذمہ داریاں غیر ملکی قوم انگریزوں پر ڈالتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے نتیجے میں برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔فسادات کی آگ نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کا تنکہ تنکہ بکھیر دیا۔اس کے علاوہ مصنفہ نے فسادات کے نتیجے سے ہونے والی خونریزی اور قتل وغارت گری کی ذمہ داری کسی ایک فرقے کے لوگوں کے سر نہیں ڈالی ہے بلکہ ان کے نزدیک ہندو مسلم دونوں فرقوں کے افراد پر یکساں طور پر تباہی کے عمل میں شریک رہے ہیں۔مصنفہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہندوستانیوں کو غیر ملکوں کی چالوں کو سمجھ کر عقلمندی کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔

اس کے علاوہ مصنفہ نے عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کی حقیقی تصویر کشی بھی کی ہے۔انہوں نے''تلاشِ بہاراں'' میں کنول کماری ٹھاکر کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش

کیا جو ایک آئیڈیل لڑکی کی صورت میں سامنے آتی ہے اور معاشرے کی بے بنیاد مظالم کی شکار عورتوں سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہوئی کہتی ہے کہ:-

''زندگی کی بنیادیں بدلنے کی ضرورت ہے ۔کام اور کوشش کی ضرورت ہے۔عام ذہنی سطح کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میں یہ کام کروگی۔''(۱۳)

مصنفہ نے ہندوستانی عورتوں کی مظلومیت اس کی بے بسی، لاچاری اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی کنول کماری ڈھاکر کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے نسوانی کرداروں کے جذبات و کیفیات کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہیں۔''تلاشِ بہاراں'' کے علاوہ جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ ''آتشِ رفتہ'' اور ''روحی'' ہیں۔

اسی دور کی اہم خواتین ناول نگار میں قرۃ العین حیدر کا نام سرفہرست ہیں۔ان کے ناولوں میں انسانی زندگی کے تقریباً تمام مسائل کا بیان ہے۔موضوع کے اعتبار سے ان کے زیادہ تر ناولوں کا مرکز تقسیم ہند اور اس کا کرب ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کی ہولناکیوں کی نشاندہی ان ناولوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ قاری پر ایک سحر طاری ہوجاتی ہے۔اس کے سامنے ماضی کی ننگی تصویریں اور انسانی سماج کے اندھیرے اجالے سبھی فنی لوازم کے ساتھ کچھ ان ناولوں کے ذریعے منکشف ہوجاتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے''''سفینۂ غمِ دل''''آگ کا دریا''''آخر شب کے ہمسفر'' اور'' کارِ جہاں دراز ہے'' ان سبھی ناولوں میں تقسیم کا المیہ انسانی حادثے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔خود قرۃ العین حیدر تقسیم ہند کے المناک حادثہ سے بے حد متاثر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ناولوں میں اس الم ناک حادثے کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' ۱۹ سال کی عمر میں لکھا جو اردو کے چند اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ناول فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ تکنیک کی نئی راہوں سے ہوتا ہوا ناول کے نگارخانے میں داخل ہوتا ہے۔اس میں صرف اودھ کا مشترکہ تہذیب وتمدن دم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ آزادی حاصل کرنے کا جذبہ جدوجہد اور فرقہ پرستی کے ساتھ طبقاتی کشمکش کا احساس بھی نمایاں ہے۔ طبقۂ نسواں کی ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے'' میں پہلی بار شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اس ناول کا موضوع تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں جس میں

قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے متعلق کہا ہے کہ ''میرے بھی صنم خانے'' ایک عظیم انسانی المیہ کی داستان ہے اور یہ المیہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ جس کے سبب سینکڑوں خاندان اور لاکھوں افراد کو خون سے لت پت اور تہہِ تیغ کیا اور ایک ایسی تہذیب اور ثقافتی ورثہ کو پامال کر دیا گیا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا یہ وہ ورثہ تھا جو باہمی اتحاد اور ہندو مسلم بھائی چارے سے وجود میں آیا تھا۔ تہذیب اور ثقافتی ورثہ کی پامالی اور تباہی کے خلاف ''میرے بھی صنم خانے'' میں سخت احتجاج ملتا ہے اور اس ناول میں اودھ کی پامال تہذیب کی تصویر مخصوص انداز میں پیش کی گئی ہے جس سے وہاں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے جہاں شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی ہیں، گومتی کا دلکش کنارا اور اس کا بانکپن ہوتا ہے، آم اور امرود کے باغیچے بھی اپنی بہار خوب دکھلاتے ہیں۔ یہ ناول دوسری جنگِ عظیم سے شروع ہو کر تقسیمِ ہند پر آ کر ختم ہو جاتا ہے اس عہد کی سماجی اور سیاسی حالات کرداروں کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ اس ناول کے تقریباً سبھی کردار ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ رخشندہ خود ترقی پسندی کی علم بردار رہتی ہے اور سماج کے اندر پھیلی ہوئی بیشمار فرسودہ رسم و رواج اور دقیانوسی رویئے سے دور نظر آتی ہے۔ رخشندہ ناول کا مرکزی کردار ہے جو ناول کی پوری کہانی پر چھائی رہتی ہے۔

مصنفہ نے اپنے ناول میں جاگیردارانہ نظام کو ایک آئیڈیل کے روپ میں پیش کیا ہے چونکہ ان طبقوں کے ذکر کرنے سے جو اعلیٰ قدریں ان جاگیرداروں کے دم سے زندہ اور وابستہ تھیں، ان کے دم توڑنے پر ان سے وابستہ قدریں بھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئیں۔ اس کے علاوہ اس ناول کے تقریباً سبھی کردار ترقی پسند نظریہ کے حامی ہیں اور بیشتر کردار انتہائی تعلیم یافتہ ذہین اور مذہبی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں کی روشن خیالی نے ناول میں ایک ایسا حصار قائم کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ نئی روشنی کا استعارہ ہیں۔ وہ نئی روشنی جو تعلیم، تکنیک، بیداری کا مطالبہ کرتی ہے، جو سنجیدگی سے معاشرہ کی تنگ نظری پر غور و خوض کر کے کسی نئی منزل کا پتہ دیتی ہے۔ ان کرداروں میں قومی خدمت کا جذبہ بھی ہے اور انسانیت کا درد بھی۔ ان کرداروں کا اپنا ایک الگ رنگ اور انفرادی پہلو ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی کے عملی نقوش سماجی زندگی پر گہرے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نقوش اس دور میں بھی اہم تھے اور آج بھی برمحل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ جن میں ''دلربا'' ''سیتا ہرن'' ''چائے کے

باغ'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو''۔ان چاروں ناولٹ میں بھی ان کے ناولوں کی طرح بدلتے حالات اور گزرتے وقت کا احساس حاوی نظر آتا ہے۔''دلربا'' میں قرۃ العین حیدر بتاتی ہیں کہ کس طرح سے بدلتے وقت اور حالات نے تہذیب، عزت اور اقدار کے معنی بدل دئیں۔جو پیشہ ایک زمانے میں بُرا سمجھا جاتا ہے وہی وقت کے بدلتے حالات کے تحت باوقار پیشہ بن جاتا ہے اور اس پیشہ سے وابستہ افراد آرام دہ وعیش پرست زندگی گزارتے نظر آتے ہیں جب کہ امراء اور اشرافیہ اپنے کھوکھلے اقدار اور حالات کے تھپیڑوں کی وجہ سے پریشان حال دکھائی دیتے ہیں۔

''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ مردانہ سماج میں خواتین کی کیا حیثیت ہے۔اس ناولٹ میں رشک قمر کا کردار مردانہ سماج کے مختلف وار سہہ کر شکست کا اعتراف کرتی نظر آتی ہے۔اس ناولٹ میں مصنفہ نے عورت کے مقدر، اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔رشک قمر اپنی زندگی میں مختلف مراحل سے گزر کر تھک ہار کر واپس اسی جگہ آجاتی ہے۔مردوں کے استحصال کے نتیجے میں وہ امرتی سے رشک قمر اور پھر مطربہ اور مغنیہ بنتی ہے۔وہ کبھی فرہاد، کبھی ورما صاحب اور کبھی آغا شب آویز ہمدانی کی پناہ چاہتی ہے لیکن یہی ہمدانی اسے پناہ دینے کے بجائے بے کسی اور انتظار کی حالات میں چھوڑ جاتا ہے اور ان کی محبت کا کھلایا ہوا پھول رشک قمر کا مقدر بنتی ہیں۔

رشک قمر اور اس کی بہن جمیلن کا جنم بھی مردوں کے استحصال کا نتیجہ ہی ہے۔وہ ناچ گا کر پیسے جمع کرتی ہیں اور اسی طرح ان کا گزارا ہوتا ہے۔بچپن ہی سے یہ سب سیاست کا شکار رہتے ہیں۔رشک قمر کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔اسی لیے وہ شادی کے خواب بھی نہیں سجاتی لیکن جب فرہاد اس سے شادی کی بابت پوچھتا ہے تو اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے کہ:۔

> ''بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں آج کل ماں باپ کے یہاں بیٹھی سوکھ رہی ہیں ہم جیسوں سے بیاہ کوئی عقل کا اندھا ہی کرے گا۔میاں آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں۔''(۱۴)

رشک قمر کے ان جملوں سے قرۃ العین حیدر ہمیں سماج کے جس اہم مسئلہ کی طرف سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔وہ مسئلہ ہے لڑکیوں کی شادی کا اور طوائفوں کا۔وہ استحصال جس کو

انھوں نے برداشت کرتے کرتے اپنا مقدر مان لیا ہے یعنی بیوی بننے کا خواب ان کے تمام ناولوں میں عورتوں کی اقتصادی حالت پر سوالیاں نشان اور تقسیمِ وطن، ہجرت، جاگیرداری اور طبقہء اعلیٰ کا اقدار تقریباً ہر جگہ جاری وساری نظر آتے ہیں۔ان کے علاوہ تقسیم وطن کے نتیجے میں نئے نئے مسائل اور انسانی بربریت کے سائے میں مزدوروں، کسانوں، دست کاروں اور عوام پر کیا کیا مصیبتیں گزریں ان سب کا بیان مصنفہ نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے اور اس مؤثر انداز سے کیا ہے کہ ان کا اسلوب قاری کے ذہن اور دل کے دریچوں کو واضح کر کے اسے سماج کے ان گوشوں سے واقفیت کرواتا ہے جن کی طرف فنکار کی تیسری آنکھ کھل کر عیوب کو سامنے لاتی ہے تاکہ تحریر سماج کی اصلاح کا باعث بن سکے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں اس اصلاح کی طرف کامیابی سے توجہ دلائی گئی ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور نئے میدان تلاشنے کی جرأت بخشتی ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ۱۹۶۲ء ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول دوسری جنگ عظیم سے شروع ہو کر تحریک آزادی، ہندو پاک کا بٹوارہ اور تقسیم کے کچھ بعد کے عرصے تک محدود ہے۔ ناول ماضی اور حال دو حصوں پر مشتمل ہے۔خدیجہ مستور نے اس ناول میں ایک مسلم متوسط گھرانے کی داستانِ شب وروز کو مکمل طور پر بیان کیا ہے۔ جہاں مختلف سیاسی نظریات کے ماننے والے لوگ ایک ہی آنگن میں بستے ہیں۔ساتھ ہی ہندوستانی معاشرے کے مختلف مسائل کو آنگن کی حدوں میں واضح کیا ہے جو گھر کا ناقابل تقسیم حصّہ ہے۔خدیجہ مستور کی پیش کردہ کہانی صرف ایک آنگن کی کہانی نہیں ہے، بلکہ ہندوستانی معاشرے کے تقریباً ہر آنگن کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ آنگن میں ہونے والی سیاست کی سرگرمیاں اور سیاسی شعور کی کارفرمائیاں آنگن میں رہنے والے افراد کے درمیان بدرجہ دکھائی دیتی ہیں اور ایک ہی آنگن میں اٹھنے بیٹھنے والے مختلف سیاسی نظریات کے حامل نظر آتے ہیں۔ ناول کا موضوع حصول آزادی ہے۔جس کا نتیجہ تقسیم وطن کی صورت اور ایک نئے ملک پاکستان کے قیام کی شکل میں ظاہر ہوا۔حصول آزادی کے لیے عوام کی شدید جدوجہد پورے ناول کی فضا میں جاری وساری دکھائی دیتی ہے مسلم لیگ سے جمیل کی شدید وابستگی کے احساسات، دادی امّاں کی جاگیردارانہ تہذیب کے زوال پر ان کی نوحہ گری کا سماں ہندو مسلم کے مابین فرقہ وارانہ تشدد کی کشمکش، چھمی کی محبت کی تلاش وجستجو، معاشی بدحالی یہ تمام

حالات اسی طریقے سے ابھرتے ہیں جن سے حالات کی ستم ظریفی، اندرونی انتشار، داخلی کرب سے پیدا شدہ محرومی، بے بسی اور لاچاری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ان کا دوسرا ناول ''زمین'' جو کہ ۱۹۸۴ میں شائع ہوا۔ یہ ناول تقسیم ہند کے بعد مسلمان مہاجرین کی زندگی اور بدلتے ہوئے حالات پر مبنی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ساجدہ ہے۔ جو اپنے والد کے ساتھ اتر پردیش سے ہجرت کر کے لاہور کے ایک مہاجرین کیمپ میں رہتی ہے۔ یہی پر اس کی ملاقات ناظم سے ہوتی ہے ناظم ایماندار اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے اپنے معاشرے کے تمام مسائل کے ساتھ معاشرے کی تنگ نظری، بدحالی اور لوگوں پر لگائی گئی پابندیوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے جب ساجدہ کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ بے سہارا ہو جاتی ہے تو ناظم اس کو اپنے گھر لے آتا ہے۔ اس گھر میں ناظم کے علاوہ اس کے والد، اس کی ماں، تابی، بہن سلیمہ، لالی، خالہ بی اور بھائی کاظم بھی رہتے ہیں۔ ناظم کی ماں بہت سیدھی سادی ہے اس کے سیدھے پن کا فائدہ گھر میں سبھی اٹھاتے ہیں اس کے شوہر کو خالہ بی سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ خالہ بی اور اس کی بیٹی سلیمہ کو گھر لے آتے ہیں۔ یہ سب دیکھتے ہوئے ناظم اپنی ماں کو اس ناانصافی کے لیے احتجاج کرنے کے لیے کہتا ہے لیکن اس کی ماں صرف محبت کے خاطر چُپ رہتی ہے اور ناظم کو سمجھاتے ہوئے کہتی ہے کہ:۔

> ''میں اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی۔ وہ بے وقوف یہ نہیں جانتا کہ لڑ کر بہت کچھ مل سکتا ہے مگر محبت نہیں مل سکتی۔'' (۱۵)

انہیں کی طرح ایک کردار لالی کا بھی ہے۔ جو اپنے شوہر کے ظلم وستم سہ کر بھی کبھی اف نہ کرتی۔ لالی ایک ایسی عورت ہے جو شوہر کی مار کھا کر بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ بیوی کی نظر میں شوہر کی محبت ہی سب کچھ ہے۔ اور اس محبت کے آگے مار کا درد کہی نظر نہیں آتا۔

اس ناول کا مرکزی کردار ساجدہ کا ہے۔ جو ناول میں نمائندہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ساجدہ مہاجرین کے ایک کیمپ میں اپنے والد کے ساتھ رہتی ہے پر اس کے والد کی اچانک موت ہو جانے سے بے سہارا ہو جاتی ہے تو ناظم کے کہنے پر اس لیے اس کے گھر رہنے چلی جاتی ہے کیوں کہ وہ یہ جانتی ہے کہ اکیلی عورت کا سبھی فائدہ اٹھاتے ہے اس کا استحصال کرتے ہیں مگر گھر

میں بھی اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خالہ بی اس کو نوکرانی بنانا چاہتی ہے تو دوسری طرف کاظم اس سے اپنی ہوس کی بھوک میٹانا چاہتا ہے لیکن وہ اکیلی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بہت Bold بناتی ہے کسی کو اپنے پر حاوی نہیں ہونے دیتی، وہ خود ایک جگہ کہتی ہے کہ:-

''وہ ساجدہ ہے اسے کوئی تابی نہیں بنا سکتا'' (۱۶)

کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جب تک عورت خود سے نہ بدلنا چاہے تب تک اپنے حالات نہیں بدل سکتی اور تب تک اپنا رتبہ، اپنا مقام نہیں پا سکتی۔ اس کے لیے سب سے پہلے خود کو مضبوط اور طاقتور بننا ہوگا تبھی وہ مرد و عورت کے استحصال سے نجات پا سکتی ہیں اور وہ خود اس پر عمل کرتی ہے:۔

''عورت کا دوسرا نام محرومی، صبر اور قناعت ہے۔ مگر یہ سوچنے کے بعد وہ تلملا اٹھتی تھی۔ اس نے بڑے عزم سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ عورت کے ان مشہور و معروف ناموں کے حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گی۔'' (۱۷)

ساجدہ اسی سوچ کے آگے بڑھتی ہے اور وہ ناظم سے شادی کر لیتی ہے مگر اس سے محبت نہ کر سکی کیونکہ وہ صلاح الدین سے محبت کرتی تھی اور اس محبت کو وہ ناظم سے نہیں چھپاتی لیکن شادی کے بعد وہ ایک آئیڈیل بیوی و ہمدرد عورت کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ وہ ہر قدم پر اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے۔

خدیجہ مستور نے عورت کی سماجی اور معاشی حیثیت اور اس کے مسائل اور زوال آمادہ پرست معاشرے سے پیدا شدہ عورتوں کی حالات، زندگی کی کشمکش کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ سماج کی محرومیاں، بے بسی اور گھٹن عورتوں کی زندگی میں رچ بس گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدیجہ مستور عام عورتوں کی لاچاری اور نفسیاتی کشمکش کے تمام وجوہات کی نشان دہی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

خدیجہ مستور کی ہم عصر رضیہ فصیح احمد، اپنے ناولوں اور افسانوں میں جدید و قدیم طرز معاشرت کی کشمکش اور تصادم میں گرفتار، پاکستانی معاشرے کی ابھرتی ہوئی ریاکاروں سے ان کی ازدواجی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ''عصمت'' میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں پہلا ناول ''سیمیں'' جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول ''آبلہ پا'' جسے ۱۹۷۶ء میں آدم جی ادبی انعام ملا۔ اس سے پہلے ناولٹ ''بھولی ہوئی منزل'' چھپ چکا تھا جو ''ایک جہاں اور بھی ہے'' کے نام سے ناول کی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے دوسرے ناولوں میں ''انتظار موسم گل''، ''متاع درد'' ہے ایک ناولٹ ''پتی چھاؤں'' اور افسانوں کا مجموعہ ''دو پاٹن کے بیچ'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

''انتظار موسم گل'' میں رضیہ فصیح احمد نے عورت کے سماجی حالات کے ساتھ ساتھ نئے نئے دوکھ درد اور معاشرے کے دوہرے روپ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہیں۔اس ناول میں اعلی طبقہ کی معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا۔''انتظار موسم گل'' میں جاگردارانہ نظام کے استحصالی رویے اور اس نظام کی غلاظت و بے راہ روی کے پس پشت ایک جذباتی لڑکی 'تارا' کی کہانی پیش کی ہے۔ پوری کہانی تارا کی اردگرد گھومتی ہے اور اس کی موت پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔اس ناول میں نوتشکیل شدہ پاکستانی سماج میں عورتوں کی تئیں دوہرے روئے اور سرمایہ دارانہ اقدار و روایات کی جدید صورت کی عکاسی کی گئی ہے۔اس ناول میں تارا کی تمام صلاحیتیں نہ صرف بے معنی ہوتی ہیں بلکہ وہ اس سماج میں گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہوتی ہے۔مردانہ سماج اور ان کے حاکمانہ نظام میں عورتوں کی تمام قدریں نا کے برابر ہوتی ہیں۔اس مردانہ سماج میں مرد صرف یہی چاہتا ہے کہ میں عورت کو جس طرح چاہوں اسے اسی طرح رہنا ہوگا چاہے ان حالاتوں میں عورت کی مرضی نہ ہو تو بھی۔مردانہ سماج میں مردوں کی خاصیت کہے یہ ان کا ego یہ صحیح ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو ہر حالت میں اپنے سے کمتر دیکھنے پر ہی سکون پاتا ہے اسے کبھی عورت کی ترقی پسند نہیں آتی۔وہ چاہتا ہے کہ عورت ہمیشہ اس کے پیر کی جوتی ہی بنی رہے۔جیسا کہ اس اقتباس میں بتایا ہے کہ مرد باہر دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح دیکھاتا ہے جیسے عورت کی عزت اس کے لیے سب سے بڑا فرض ہو،لیکن گھر میں آکر وہی اوقات دیکھاتا ہے:

> ''ایک لڑکا جو بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں باہر دنیا کو دکھانے کے لیے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولتے ہیں کہیں بھی جانے میں بیوی کو پہلے گزرنے دینے کیلیے راستہ چھوڑ کر مودب کھڑے رہتے ہیں مگر گھر آکر یہی چاہتے ہیں کہ جس سلیپچی میں انھونے منھ دھویہ ہے کلی کی ہے کھنکار تھوکا ہے، اس کا پانی بیوی ہی پھینکے کیوں کہ یہ اس کا فرض ہے۔''(۱۸)

مردانہ سماج میں عورت کے حالات بد سے بدتر ہوتے ہیں۔مردوں کا بس چلے تو وہ

عورت کی سانسوں پر بھی اپنا قابو جمائے رکھے اگر عورت سانس لے تو وہ بھی اس سے پوچھ کر۔ مرد کا بنایا Artificial سماج میں مرد اپنی شان وشوکت اور عزت بنائے رکھنے کے لیے سماج میں سب کے سامنے عورت کو بڑی عزت دیتا ہے مگر گھر میں آتے ہی عورت کی پھر وہی بدتر زندگی، مرد کی غلامی۔ اس دوغلے سماج میں عورت کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں پدری سماج میں مردوں کے مزاج، عادات اور اس کی زمیندارانہ خصوصیتوں کو پیش کیا ہے۔ مردوں کا ایک اور حیوانی روپ، جہاں عورت کو لے کر ایک ہی سوچ ہوتی ہے کہ عورت صرف ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان ہے۔ ان کے دل میں عورت کو لے کر پاکیزہ محبت نہیں بلکہ اپنی عیاشیوں کو پورا کرنا ان کا شوق ہوتا ہے۔ جب تارا کو طاہر کی عیاشیوں کا پتا چلتا ہے تو وہ طاہر کو صحیح راہ دکھانے اور یہ غلط کام کرنے سے روکتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ:۔

> ''امی کو دیکھو، انھوں نے ابّا پر سختی کرنی چاہی، ٹوں ٹاں کا نتیجہ کیا ہوا۔ ابا گھر سے چلے گئے۔ کھلے خزانے انھوں نے اس مسکین عورت کو گھر میں ڈال لیا اور امی جائے نماز پر بیٹھی آنسوں بہاتی رہیں۔ اس سختی سے کیا فائدہ! سب کی بدنامی ہوئی اور سب سے زیادہ خود ان کی۔'' (۱۹)

ساتھ ہی مصنفہ نے پاکستانی معاشرے کے دوہرے معیار کو بے نقاب کر کے حقیقت کو ہمارے سامنے رکھ کر مرد وعورت کی حیثیت پدری سماج میں کس طرح کی ہے اس کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس مردانہ سماج میں مرد ہمیشہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور خود مختار بنائے رکھنا پسند کرتا ہے جب کہ عورت کی آزادی، خود مختاری، ان کے مساوی حقوق اور آرزوؤں وخواہشوں کو اپنے پیروں تلے روندنے میں ہی سکون پاتا ہے۔ اس ناول میں نسوانی کردار ایسی صورتِ حال میں ہمت واستقلال اور صبر وضبط کو تھامے ہوئے زندگی سے مایوس نظر آتی ہیں۔ مصنفہ نے زمیندار طبقے کے ظلم وستم، اس کی فرسودہ اقدار اور اس طبقے میں عورتوں کے استحصالی حالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تقسیم وطن کو اپنے ناولوں کا موضوع بنانے والی ایک اور خواتین ناول نگار جیلانی بانو ہیں۔ یہ افسانہ نگار کی راہ سے اردو ادب میں داخل ہوئیں اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ ''ایوانِ غزل'' ۱۹۷۶ء ان کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کے بارے میں مشرف علی لکھتے ہیں کہ:۔

''ایوانِ غزل'' کا پہلے نام ''عہدِ ستم'' تھا۔لیکن ایمرجنسی کی وجہ سے کتابوں پر سنسر شپ عائد تھی، اس لیے اس کا نام بدلنا پڑا اور یہ ناول ''ایوانِ غزل'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔''(۲۰)

یہ ناول آزادی کے بعد تصنیف کی جانے والی تخلیقات میں اہم ادبی مقام رکھتا ہے۔ اس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ طبقہ اگرچہ موجودہ سماجی زندگی سے تقریباً ناپید ہو چکا ہے لیکن اس کی یاد ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ان کے ناول ''ایوانِ غزل'' اور ''بارشِ سنگ'' آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ہفتہ وار نشر کیا جا چکا ہے۔

جیلانی بانو نے جس وقت ادبی زندگی کا آغاز کیا وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا آخری زمانہ تھا۔ حیدرآباد سیاسی انتشار اور ہنگامی دور سے گزر رہا تھا۔حیدرآباد کی مخصوص تہذیب اور روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ جاگیردارانہ ماحول ومعاشرے کا خاتمہ ہو رہا تھا ایک نئی تہذیب وجود میں آرہی تھی۔تقسیم ملک کی وجہ سے ہونے والے فسادات، خوں ریزی نے سینکڑوں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے تھے اور دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ہر طرف افراتفری کا عالم تھا ساتھ ہی ساتھ مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی تحریک کا وہ نقشہ بھی تھا جس نے جاگیرداروں اور نوابوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔تلنگانہ کسان تحریک، جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں پر ہونے والے ظلم وستم کا لازمی نتیجہ تھی۔کسانوں اور مزدوروں نے اپنے حق اور انصاف کے لیے جدوجہد کیا اور قربانیاں دیں۔جیلانی بانو نے ان سب حالات، واقعات ومسائل کا خود مشاہدہ کیا تھا۔جس نے ان کے فکر واحساس کو ایک سمت عطا کی۔ان کے تخلیقی سفر میں ان تمام واقعات وحادثات نے اہم رول ادا کیا ہے۔غرض یہ کہ گھر کا ادبی ماحول، مطالعے کا شوق اور اس عہد کی تہذیب وثقافت اور سیاسی وسماجی صورت حال نے ان کی شخصیت اور فکر وتعمیر میں اہم رول ادا کیا۔

جیلانی بانو نے اس منتشر نظامِ فکر کو اپنے مشاہدے، اپنے پروازِ تخیل اور اپنی طرزِ نگارش سے ایک نئی زندگی دے کر ''ایوانِ غزل'' میں زندہ کر دکھایا ہے۔اس میں سلطنت آصفیہ کا زوال اور آزادی کی بڑھتی ہوئی لہر کے ساتھ استحصال کے کئی روپ سامنے آتے ہیں۔جس میں لوگ زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھیں۔جھوٹی شان وشوکت اور آب وتاب کو برقرار رکھنے کے لیے قرض لے کر پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہندوستان انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں

مشغول تھا لیکن ریاست حیدرآباد میں آزادی کا وہ تصور نہ تھا جو ملک کے دوسرے خطوّں میں تھا کیونکہ یہاں کی عوام پر نظام کی گرفت مضبوط تھی۔ یہاں کے جاگیردار طبقے کو اس تحریکِ آزادی سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ وہ ریاست حیدرآباد کو اس تحریک سے الگ رکھنا چاہتے تھے لیکن بدلتی ہوئی سیاسی وسماجی فضا کی وجہ سے یہاں بھی نئے رجحانات پیدا ہوئے تھے یہاں کچھ ایسے باشعور لوگوں کا بھی طبقہ تھا جو ملک کی آزادی کو اہمیت دیتا تھا یہ طبقہ انگریزوں کے ظلم کے خلاف عوام کو الگ کر رہا تھا اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم کا خاتمہ بھی چاہتا تھا، لیکن ریاست حیدرآباد کی عوام قومی وبین الاقوامی سیاست سے ابھی بہت کم واقف تھیں کیونکہ:

''اخباروں پر سخت پابندی تھی کہ باہر کی سیاسی خبروں کو اہمیت نہ دی جائے کیونکہ حیدرآباد میں اس وقت بڑا سکون تھا۔ یہاں ابھی کانگریس کی کوئی سیاسی اہمیت تھی نہ کسی دوسرے سیاسی تنظیم نے سر اٹھایا تھا۔ عوام اعلیٰ حضرت کے وفادار تھے اور تا ربد اس ریاست کو قائم ہونے کی دعاؤں میں شریک رہتے تھے۔''(۲۱)

''ایوان غزل'' ایک پروقار عمارت ہے۔ جو وقت اور حالات کی زد میں آکر پوشیدہ ہو چکی ہے۔ اس عمارت میں رہنے والے لوگ پرانی قدروں سے وابستہ اور والہانہ عقیدت رکھتے ہیں ان میں بعض وقت کی آندھیوں میں بہہ گئے اور بعض اسی ماحول میں جکڑے ہوئے ہیں اور بعض اس سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ انہیں پرانی قدریں سے اپنا دامن چھڑا نہیں پاتے۔ ''ایوان غزل'' کے بانی دکن کے پرانے جاگیردار واحد حسین ہیں جن کی جمالیات انہیں ہر وقت سرشار رکھتی ہے لیکن ان کا بیٹا ایک تاجر کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ یہ ناول سماج، تہذیب اور پورے دور کا کرب ہے جس میں ان گنت کردار اپنی بہار کھلاتے ہیں۔ اقدار، افتاد اور اطوار ورویوں کے اس بھنور میں تقریباً تین نسلیں پھنسی ہوئی ہیں۔ مصلحتیں خودغرضیاں، سلیقے، جذبات، منصوبے غرض وہ سب کچھ جو ایک جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسان کی خاصیتیں ہوتی ہیں وہی ایوانِ غزل کے کرداروں کا مقدر ہیں۔ اس بارے میں پروفیسر حمید سہروردی لکھتے ہیں:۔

''جیلانی بانو نے ایک اہم ناول ''ایوانِ غزل'' لکھا ہے جس کا ماحول حیدرآباد کی مٹتی ہوئی تہذیب ہے۔ انھوں نے ناول میں ایک خاص ذہنی

رویے کو پیش کیا ہے۔ آج بھی حیدرآباد کے نواب اپنی جھوٹی شان برقرار رکھنے کے لیے قرض لیتے ہیں مگر قرض نہ ملنے کی صورت میں اپنا عزیز سے عزیز سرمایہ فروخت کر دیتے ہیں۔ جیلانی بانو نے کردار واقعات کو توازن و تناسب کے ساتھ برتا ہے۔'' (۲۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹی شان بنائے رکھنا، تہذیب کی شان سمجھا جاتا ہے۔ اسی مٹتی ہوئی تہذیب کے ماحول کا بیان مصنفہ نے کیا ہے۔ انہوں نے اس دور کی حقیقی زندگی کی نمائندہ عکاسی کی ہے۔

ان کا دوسرا ناول ''بارشِ سنگ ۱۹۸۵ء'' میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے تلنگانہ کے علاقے میں بسے دیہی مسلم خاندان کے اور نئے سیاسی دور میں ابھر کر آنے والے سرمایہ داروں کی رشتہ دوانیوں اور ظلم کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انھوں نے نظام دور میں ضلع محبوب نگر کے دیہی عوام پر لیے گیے ریڈی برادری کے مظالم کی داستان کو نہایت فن کاری سے پیش کیا ہے۔ ''ایوانِ غزل'' کے مقابلے بارش سنگ میں مصنفہ نے زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔

بارشِ سنگ کی کہانی چیکٹ پلی، تلنگانہ سے شروع ہوتی ہے اور اس میں آخری نظام کے دورِ حکومت میں جاگیردارانہ نظام کی تبدیلی، اس زمانے کے عام مسلمانوں کی غربت، خوشی، دکھ درد اور عقائد کی مصنفہ نے بہت اچھی طرح سے تصویر پیش کی ہے اور ساتھ ہی ان کے حقیقی پہلوؤں کو بھی بیان کیا ہے۔ اس ناول کی ابتداء ہی فیض کی نظم ''آج کے نام'' سے ہوتی ہے:-

''آج کھیتوں میں بیج پڑے گا بہاروں کے بیج، ارمانوں کے بیج ابھی صبح نہیں ہوئی۔ پورب کی اور سے بڑھتے ہوئے، سیاہ بادوں نے پوری ''چیکٹ پلی'' کو ڈھانپ لیا ہے۔ چیکٹ پلی میں اجالا دیر سے آتا ہے۔ کچھ گھروں میں تو کبھی نہیں آتا۔ اس گھور اندھیارے میں احمد بی کی ہلورے لیتی ہوئی آواز اور چکی کی گھوں گھوں بستی والوں کے دلوں میں اجالے کی امید جگاتی ہے۔ وہ مان لیتے ہیں کہاب اجالا ہونے والا ہے'' (۲۳)

اصل میں اس نظم کو پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام نے جاگیردار

نظام کی جگہ لے کی تھی۔ تلنگانہ ہو یا ملک کا پورا دیہی علاقہ ہو، آج بھی غریبوں کی بھوک امیروں کی تعیش پرستی کی نذر ہوگئی ہے۔ یہ ناول اردو ناول نگاری میں اہم مقام کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ دو ناولٹ ''نغمے کا سفر''، ''جگنو اور ستارے'' بھی جیلانی بانو نے لکھے ہیں۔

بانو قدسیہ کا شمار بھی اردو کی معتبر ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ مشہور ادیب اشفاق احمد کی بیوی ہیں۔ انہوں نے افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ ناول بھی تخلیق کیے ہیں۔ ''شہر بے مثال'' ان کا پہلا ناول ہے جو پہلی بار ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

> ''بانو قدسیہ ایک تو ناول نگار کے طور پر بھی ہمارے سامنے ہیں جن کے ناول ''راجہ گدھ'' (۱۹۸۱ء) ''ایک دن'' (۱۹۹۵ء) ''پروا'' (۱۹۹۵ء) ''شہر بے مثال'' (۱۹۶۷ء) اور ''موم کی گلیاں'' (۲۰۰۰ء) بیحد اہم ہیں ''راجہ گدھ'' ان چاروں ناولوں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ ویسے ''ایک دن''، ''موم کی گلیاں'' اور ''پروا'' کو ناولٹ یا طویل مختصر افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔'' (۲۴)

ان کا مشہور ناول ''راجہ گدھ'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول پاکستانی معاشرے پر مبنی ہے۔ ''راجہ گدھ'' میں حلال و حرام رزق کے مسئلے کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور ایک مخصوص نفسیاتی فلسفے کی شکست و ریخت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس ناول کے بارے میں وہاب اشرفی یوں بیان کرتے ہیں:۔

> ''راجہ گدھ کا پلاٹ ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہم آہنگ نظر آتا ہے، گدھ ایک علامت ہے جو انسان کے حرص و ہوس کا استعارہ ہے۔ گدھ مردہ کھاتا ہے انسان بھی حرام کی کمائی، رشوت خوری، دھوکہ اور فریب کی زندگی گزارتا ہے۔ گویا وہ بھی گدھ کی ہی زندگی گزارتا ہے۔'' (۲۵)

یہ ناول بنیادی طور پر ایک اخلاقی ناول ہے جس میں عوام کی توجہ رزقِ حلال کی جانب مبذول کرائی گئی ہے اور رزقِ حرام سے نفرت کی تلقین کی گئی ہے۔ دورِ حاضر کے پورے معاشرے میں جس طرح حرام رزق کو تقویت اور فروغ مل رہا ہے اس سے انسان نہ صرف حصولِ دولت کی ہوس کا نشانہ بن رہا ہے بلکہ وہ تمام پابندیوں کو خواہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی قدریں ہی کیوں نہ ہوں بالائے طاق رکھ کر آزادی سے زندگی جینا چاہ رہا ہے۔ بانو قدسیہ انسانوں کی اس بے راہ روی کا خاص سبب مغرب کے آزادانہ طرزِ رہائش کو قرار دیتی ہے۔

ناول کا اہم کردار سیمی شاہ ہے جو مارڈن تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ہے ساتھ ہی نہایت حساس اور جذباتی بھی۔ گھر میں والدین کی بے توجہی اور لاپرواہی نے اس کے اندر تنہائی محرومی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ذہنی سکون کے خاطر وہ ہاسٹل میں پناہ ڈھونڈتی ہے جہاں نہ کسی رشتے کا دباؤ ہوگا اور نہ ہی جذباتی و ذہنی تھکن محسوس کرنی پڑے گی لیکن جذباتی محبت کی تشنگی اسے ہر جگہ پریشان کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم جماعت آفتاب کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ سیمی شاہ آفتاب کی بے وفائی کے بعد ٹوٹ جاتی ہے اور ایک ایسے ہمدرد مشفق کی فراق میں رہتی ہے جو اس کے زخمی جذبات پر مرہم رکھ سکے۔ اس درمیان ان تمام جذباتی تناؤ سے نجات پانے کے لیے آفتاب کے دوست قیوم سے دوستی کر لیتی ہے تا کہ آفتاب کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کو تازہ کر سکے کیونکہ آفتاب کی بے وفائی کے بعد سیمی کے لیے اپنے وجود کی معنویت باقی نہیں رہتی اور نہ اب اسے اپنے جسم کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی جان کی۔ وہ خود کو اس قدر فراموش کر دیتی ہے کہ قیوم کے جنسی مطالبے کے سامنے خاموشی سے خود کو اس کے حوالے کر دیتی ہے۔

> ''آفتاب نے یہ غزالِ شہر شکار کیا تھا۔ مجھے اس مردہ لاش کو کھانے کا حکم تھا۔ مریل نڈھال کافور درخت کے تلے نیم مردہ پڑی تھی۔ جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب اسے فکر نہ تھی کہ اس کوڑے کے ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے، جب اس نے اس کا کف بند کیا تو وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹی تھی۔ وہ میرے ساتھ نہ تھی نہ میرے مخالف۔ یہ بھی عجیب رابطہ تھا۔ مردا کو گدھ ہڈیوں تک شفاف کر چکا تھا لیکن وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے کے لیے موجود ہی نہ تھی، وہ اس وقت کہیں اور تھی، کسی اور کے ساتھ تھی۔''(۲۶)

آخر میں سیمی شاہ اپنی ذات اور وجود سے انتقام لینا شروع کر دیتی ہے اور ان تمام جذباتی اور ذہنی الجھنوں کے مسائل کا حل نہ پانے پر موت کو گلے لگاتی ہے۔

اسی دور کی سنجیدہ خواتین ناول نگار میں الطاف فاطمہ کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے مشہور ناولوں میں ''چلتا مسافر''، ''دستک نہ دو''، ''نشان محفل'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا مشہور ناول

''دستک نہ دو'' ایک ضخیم ناول ہے جو ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول میں شروع سے لے کر آخر تک ایک میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا ہے۔اس ناول کا انداز بے حد سادہ ہے۔انہوں نے جو قصہ بیان کیا ہے اس میں روزمرہ کی زبان اور ضرب المثل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔مثلاً:

''فوق البشر اپنے ماحول کی بے حسی اور بداعمالی سے اکتا جاتا ہے تو وہ اس سے نکل بھاگتا ہے۔وہ کبھی یہودا کے شہر بیت الحرم کی گلیوں میں بھاگتا ہے، کبھی حرا میں بیٹھ کر گیان کرتا ہے، کبھی اپنی بے چین آتما کے لیے نروان کی تلاش میں سرگرداں ہوکر رات کے اندھیرے میں پاٹلی پتر کے مکلّف ایوانوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک احمق اور جلد باز چھوکری کے روپ میں اپنے گھر کی سلامتی اور سکون سے منہ موڑ کر اجنبی شہر کی گلیوں میں دل شکستہ اور بے سہارا پھرتا ہے۔''(۲۷)

اس ناول کا مرکزی کردار گیتی آرا ہے۔اسے اپنی ماں کی محبت نہ ملنے کی وجہ سے وہ ضدی اور چڑچڑی ہوجاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اماں بیگم کی تینوں بیٹیوں میں سب سے زیادہ بدصورت ہے۔دیکھنے میں چینیوں کے بچے جیسی نظر آتی ہے:

''آنکھیں چھوٹی اور تکونی تھیں اور ناک چپٹی۔اس کے بال بھی بہت اونچے اونچے کٹے ہوئے تھے۔''(۲۸)

اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ناک چپٹی ہے بالکل چینیوں جیسی۔مگر رنگ سانولا اور بال چھوٹے چھوٹے۔اس کی شکل دوسری بہنوں سے نہیں ملتی ہے شاید اس لیے اماں بیگم اسے کم پسند کرتی ہیں اور ہر بات میں روک ٹوک کرتی۔بے وجہ طعنے مارتی رہتی ہیں جس وجہ سے گیتی آرا احساسِ کمتری کا شکار ہوکر ضدی و چڑچڑی اور بے باک ہوجاتی ہے۔ایک دفعہ جب شبراتی نے اپنے حصے کے بیر مانگنے کے لیے اس کی فراک کا گھیر پکڑ کر زور سے کھینچا تو گیتی نے شبراتی کو زوردار تھپڑ مارا اور اس کے حصے کے بیر بھی خود ہی کھا گئی:-

''بی بی یہ! تو بالکل بے ایمانی ہے۔اب ہمارے حصّے کے بیر تم نہیں کھا سکتیں۔''چُتّا نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''کیوں! کیوں نہیں کھا سکتی؟ مَیں تو ضرور کھاؤں گی یہ سارے بیر مَیں نے ہی تو جھاڑے ہیں۔''

اس نے اپنی تکونی آنکھیں شرارت سے نچائیں۔''واہ یہ بیر ہمارے حصّے کے ہیں لاؤ جی! چھوڑو ہمارے بیر''

شبراتی نے اس کی فراق کا گھیر پکڑ کر زور سے کھینچا۔

ارجمند کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔اور موٹی گدبدی گیتی نے دو دو ہاتھ چنّا اور شبراتی کے جڑ دیے اور پھر مزے سے بیروں میں جھٹ گئی۔''(۲۹)

اس میں اتنا غصہ ضرور ماں کی محبت سے محرومی اور نظر انداز کے سبب پیدا ہوا ہوگا۔اگر اماں بیگم دوسری بیٹیوں کی طرح اسے بھی محبت سے گلے لگا کر رکھتی تو شاید اس میں یہ ضد اور غصہ اتنا نہ ہوتا کی اتنی چھوٹی بات کے لیے وہ اپنی بہنوں پر ہاتھ اٹھا دیتی بلکہ اس میں رشتوں کی سمجھ ہوتی۔

گیتی کو اگر کوئی محبت کرتا یا اس کے دلی جذبات کو سمجھتا تھا تو وہ صرف اس کے والد۔وہ گیتی سے بے انتہاں محبت کرتے ہیں۔انہیں یہ موٹی بھدّی بچی سب بیٹیوں میں سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔یہ اقتباس دیکھئے جس میں گیتی کے والد اس کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں:۔

''انھوں نے اس کے دونوں چھوٹے، موٹے ہاتھ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سوچا۔''میری یہ چپٹی، چینیوں کی سی شکل والی بیٹی کتنے فراخ اور حساس دل والی ہے۔''انھوں نے اس کے معمولی بلکہ بدصورتی سے بے حد قریب خدوخال کو بغور دیکھا۔ان میں کتنا حُسن تھا، کتنا سکُون اور اطمانیت تھی! پھر انھوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور بولے

''گیتی! تم کو ایک بات بتاؤں؟''

''بتایئے۔وہ اشتیاق سے بولی۔

''تم میرے سب بچوں میں، سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔''(۳۰)

اس کے والد گیتی سے بے انتہاں محبت تو کرتے لیکن اپنی بیوی سے ڈرتے بھی تھے پھر بھی ان کو جب بھی وقت ملتا تو وہ گیتی کو خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ یہ جانتے ہے کہ گیتی کا دل معصوم ہے وہ دوسروں کے لیے نیک تمنا رکھتی ہے گویا وہ اس کی باطنی حسن کو پہچانتے تھے جس میں سکون جھلکتا ہے۔ والد کی محبت نے ہی گیتی کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچایا ہے۔ اسی لیے گیتی گھر میں والد کے علاوہ کسی کی نہیں سُنتی اور نا ان کی پرواہ کرتی۔ وہ اپنے گھر سے گھنٹو غائب رہتی اور اس وقت وہ پارک یا مالی کے گھر سو کر اپنا وقت گزارتی۔ اسے غریبوں سے لگاؤں تھا اسی لیے وہ ان کے سامنے محبت سے پیش آتی اور زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی لیکن وقت اور حالات نے اس کے کردار کو اس وقت بدل دیا جب اس کے والد کے انتقال اور مسعود (اس کا کزن بھائی) سے محبت میں ناکامی ملنے پر یہ پوری طرح ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ اس کے کردار میں بے باکی اور باغی جذبات تھے اب ختم ہو جاتے ہیں اب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسوں بہانے لگتی ہے۔ کچھ وقت پہلے جب اس کی ماں پیسے اور دنیاوی آرائشوں کے خاطر اس کا رشتہ ایک بوڑھے کرنل سے پکّا کر دیتی ہیں تو گیتی بغاوت کرتی ہے اور اس رشتے کے لیے صاف منع کر دیتی ہے اور پھر یہ رشتہ نہیں ہو پاتا لیکن آج جب جنرل آصف کے کزن بوڑھے کرنل سجاد اس کے سامنے شادی کا پیغام رکھا ہے تو وہ فوراً ہاں کر دیتی ہے کیونکہ اس کی سوجنے سمجھنے کی قوت ذائل سی ہو جاتی ہے وہ اپنے خود کے اچھے بُرے فیصلے آنکھ بند کر کے بغیر سوچے سمجھے لے لیتی ہے۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار مفلس چینی مسلم صفدر یٰسین کا ہے۔ جو تلاشِ معاش کے لیے ہندوستان آتا ہے اور اپنے مالک کی دکان میں سیلس مین کا کام کرتا ہے۔ اس کو ریشم پر مصوری کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ گیتی آرا سے اس زمانے سے محبت کرتا ہے جب وہ کو کہلاتی تھی کیوں کہ وہ دیکھنے میں چینی لگتی ہے جب صفدر گیتی کو پہلی بار دیکھتا ہے تو اسے اپنے گھر کی یاد آجاتی ہے وہ کہتا ہے کہ:۔

> ''نہ جانے کیوں اس کے چلتے چلتے گھر کی یاد آ گئی۔ اپس نے دُھندلے اور کُہر میں چھُپے ہوئے افق کو تاکتے ہوئے سوچا۔'' کیا پتا پیکنیک میں بھی ایسے ہی غضب کی سردی ہو اور نہ جانے، نہ جانے میری ماں کیا کر رہی ہوگی۔ دُبلے جسم، چپٹے اور خُب صورت دہانے والی عورت جس کے ہاتھ محنت کرنے

کے باوجود نرم اور کنول کی طرح نازک ہیں اور میری دونوں چھوٹی بہنیں !
معلوم نہیں اسکول جاتی ہیں یا نہیں۔''(۳۱)

صفدر جب بھی گیتی کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے گھر کی یاد آجاتی ہے اور گھر کا سارا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا اس لیے وہ گیتی کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ وہ پیار سے اسے بے بی ایلی فنٹ کہتا ہے۔اس کی محبت پاکیزہ تھی جب گیتی آرا جامن کے پیڑ سے گر جاتی ہے اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔اسے ہسپتال میں داخل کرایا جاتا ہے تو صفدر اس سے چوری چھپے ملنے جاتا ہے اور اس کو خوش کرنے کے لیے تحفے لے جاتا ہے اور بندر جیسی شکل بنا بنا کر اسے ہنساتا تھا اسکی پریشانیوں کو سمجھتا اور آنے والی منزلوں کے لیے اسے صحیح مشورہ دیتا تھا۔گیتی آرا کی زندگی میں صفدر ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

اردو ناولوں میں قصے کہانیوں کی ماہرین فنکار رشیدہ رضویہ کے ناول ''لڑکی ایک دل کے ویرانے میں''''اسی شمع کے آخری پروانے''''گھر میرا راستے غم کے''میں عراق شہر کی اندرونی سیاست کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ مختلف نظریات رکھنے والی اس سیاست سے عوام کی سماجی، معاشرتی واقتصادی حالات بہت خراب ہونے سے دلی سکون ختم ہوجاتا ہے اور بعض اوقات سیاست کی غلط سرگرمیوں سے عوام اور اجتماع دونوں کو برباد کردیتی ہے جس سے معاشرے کی پوری تہذیب ٹوٹتی نظر آتی ہے اور انقلابی لوگ گمنامی کے دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔

''لڑکی ایک دل کے ویرانے میں'' امیرہ کی کہانی پیش کی گئی ہے جو اس ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔رشیدہ رضویہ نے امیرہ کو ایک مثالی لڑکی بنا کر پیش کیا ہے۔جس کے دل میں آدرشوں کی خاطر مرمٹنا مردوں کے مقابلے میں زیادہ شدید ہوتا ہے۔یہ عراق کے عیاش سردار سالامان کی لڑکی ہے۔اس کے والد کئی شادیاں کرتے ہیں۔پہلی بیوی سے دس بچے ہوتے ہیں۔بیوی کے انتقال کے بعد ایک یتیم لڑکی صابرا سے شادی کرنے پر اس سے بھی چار بچے اور ہوجاتے ہیں مگر صابرہ کے مرنے پر وہ عراق شہر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔امیرہ بچپن سے ہی ذہین، ہوشیار اور انقلابی لڑکی ہے لیکن جب عراق کے فیوڈل طبقہ کے عیاش پرست ہونے سے یہ پریشان اور تکلیف میں آجاتی ہے۔

امیرہ ایک اسکول میں معلّمہ کی حیثیت سے بچوں کو پڑھاتی ہے اور جو بھی تنخواہ ملتی ہے

اسے یہیں کے بچوں پر خرچ کر دیتی ہے۔اسکول کے علاوہ امیرہ کمیونسٹ پارٹی کی بھی ممبر بنتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر عبدالکریم قاسم جب اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے تو اس کے خلاف سازش کی جاتی ہے جس کے سبب اس کی موت ہو جاتی ہے۔امیرہ عراق چھوڑ کر پہلے یروشلم پھر دمشق آ کر اپنی تصاویر کی نمائش کرتی ہے اس کے بعد وہ لندن چلی جاتی ہے جہاں اس کی ملاقات ایک پاکستانی لڑکے کریم سے ہوتی ہے۔امیرہ اس سے دل و جان سے محبت کرنے لگتی ہے مگر کریم دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے دل سے کھیل کر چھوڑ دیتا ہے اور پاکستان آ کر ایک رئیس عورت سے پیسوں کے خاطر شادی کر کے اس کا غلام بن جاتا ہے۔اس کے اشاروں پر ناچتا ہے اور پھر ایک دن اچانک ایک سڑک حادثے میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔دوسری طرف امیرہ کے دوست نعمان انقلاب لانے کے لیے وزارت دفاع میں جا کر دشمنوں پر گولیاں چلاتا ہوا مارا جاتا ہے۔امیرہ کی زندگی میں کریم کی بے وفائی اور اپنے عزیز دوستوں میں عبدالکریم قاسم و نعمان جیسے دوستوں کا ساتھ چھوٹ جانا کسی بھیانک حادثے سے کم نہیں ہوتا۔پھر بھی وہ کو زندگی سے ہار مارنے اور ٹوٹ کر بکھر جانے سے پہلے اپنے آپ کو مضبوط بنا لیتی ہے۔اگر اس کی جگہ کوئی اور کمزور لڑکی کا کردار ہوتا تو وہ بہت پہلے ہی زندگی سے ہار مان کر اپنے آپ کو ختم کر لیتی۔رشیدہ رضویہ نے اس ناول میں ایک مضبوط لڑکی کے کردار کو پیش کیا ساتھ ہی ملکِ پاکستان اور عراق کے سیاسی، سماجی معاشرتی حالات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہاں کے ملکوں میں امن وسکون بالکل نہیں ہے۔

ساجدہ زیدی بنیادی طور پر تو شاعرہ ہیں لیکن انہوں نے اردو ادب کی کئی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔جن میں منظوم ڈرامہ ''سرحد کوئی نہیں'' ''چاروں موسم'' تنقیدی مضامین کے مجموعہ میں ''تلاش بصیرت'' ''گزرگاہ خیال'' ناولوں میں ''موجِ ہوا پیچاں'' ''مٹی کے حرم'' اور نفسیاتی میں ''شخصیت کے نظریات'' ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز اور شاعری مجموعوں میں ''جوئے نغمہ'' ''آتش سیال'' ''سیل وجود'' ''آتش زیرپا'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ان کا ناول ''مٹی کے حرم'' ۲۰۰۰ میں شائع ہوا۔یہ ناول ''موج ہوا پیچاں'' کے مقابلے میں زیادہ ضخیم ہے۔ساجدہ زیدی نے اس ناول میں انسانی زندگی کی جدوجہد اور زوال پذیر زمیندار گھرانے کو موضوع بنایا۔اس ناول کے کردار سماج میں اپنی خواہشیں اور محبتوں کے ساتھ ساتھ تنہائیاں اور محرومیوں میں اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سماج کے بدلتے

ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے ہوئے رشتے اور پُرانی قدروں کے خاتمے کے ساتھ نئی قدروں کا آغاز، رومانی زندگی کے ساتھ ابھرنے والا غم، بغیر چاہت کے سب کچھ مل جانا اور ایک پل میں سب کچھ کھو جانے کے بعد بھی بہت کچھ پا لینے کی خوشی تو کہیں سماجی نابرابری اور اس کا درد اور زندگی کی نارسائی کو بڑی خوبصورتی سے ناول میں پیش کیا ہے۔

اس ناول میں زندگی کا کرب، جدوجہد، سماجی ناہمواریاں، تنہائی، سماجی نا برابری، نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ نئی زندگی کے مسائل اور تعلیم کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ اس ناول میں ہر کردار اپنی ایک الگ اہمیت رکھتا ہے اور کوئی بھی کردار ناول نگار کی مرضی کا پابند نہیں ہے۔ کرداروں کا یہی فطری روّیہ اس ناول کی کامیابی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار سعیدہ ہے جس کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ اس ناول کے تقریباً تمام کردار رشتوں کے بھرم، پریشانیوں کی صورتوں، محبت کی دُنیا اور شک وشبہ میں گھرے ہوئے ناول کے اختتام تک پہنچتے ہیں اور تاریخی صداقتوں، تہذیبی وراثتوں اور اخلاقی پابندیوں کے تانے بانے سے نئی نسل کو پیغام دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بتانے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اپنی شناخت قائم رکھنی ہے تو انہیں رشتوں کا احترام اور قدروں کی پاسداری کرنا تاکہ اس کی شخصیت وقت کے ساتھ نہ بدل سکے۔ ساجدہ زیدی نے نفسیاتی تجزیہ وزندگی کی حقیقت کو بہت اچھے سلیقے سے پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں وقت خود ایک کردار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

''مٹی کے حرم'' کے آغاز سے ہی فرزانہ اپنے گھر سے انجانی منزل کی طرف رواں دواں اپنی بیوہ ماں اور بہنوں کے ساتھ ٹرین میں سفر کرتی ہے۔ اس سفر میں فرزانہ پُر آواز میں اشعار پڑھتی ہے تب مصنفہ پوری طرح فرزانہ کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ ساجدہ زیدی ''مٹی کے حرم'' میں پس پردہ رہتے ہوئے بھی ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے ''موج ہوا پیچاں'' ناول لکھا تھا۔

مٹی کے حرم میں ساجدہ زیدی کے مشاہدات، تجربات، فکر اور ان کی تہذیبی ومعاشرتی تناظر میں گہرا مطالعہ اور شعور نظر آتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے زمیندار گھرانے کو موضوع بنایا ہے۔ تمام کردار اپنے مسلے لیے ہوئے ارمانوں، تمناؤں، آرزوؤں اور استحصالی کیفیات کے طور پر اپنی موجودہ شناخت کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کی خاص خصوصیت ان کے کرداروں کی ہے۔ یہ اشراف کردار مصیبت کے وقت بھی خودداری اور صبر پر قائم رہتے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی مصنفہ نے نئی تہذیب اور

اقدار کے تقاضوں کے ساتھ طبقہ اشرافیہ کی نئی نسل کے مطابق، یقین و بے یقینی کی آویزش، رومانی انداز، واقعات، مذہب سے برائے نام واسطہ، انٹر کاسٹ میریج، کہیں نارسائی تو کہیں امیدیں یہ سب واقعات اس ناول کو ایک پُر لطف قصے میں بدل دیتے ہیں۔ اس ناول میں تین مرحلے واضح ہیں۔ جن میں پورے ہندوستان کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان مقامات میں نئی نسل کی زندگی، اس کے تقاضے اور مسائل ہیں تو دوسری طرف کرداروں کی خودمختاری نے ناول میں تہذیبی قدروں اور رشتوں کو پورا کیا ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں شائع ہونے والے ناولوں میں ترنّم ریاض کا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۲ء اور ''برف آشنا پرندے'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئے ہیں۔ ''برف آشنا پرندے'' ان کا ایک طویل ناول ہے جو کشمیر کی فضا پر مشتمل ہے۔ ترنّم ریاض خود کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے ناولوں کے علاوہ افسانے اور شاعری بھی کی ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

ترنم ریاض کا پہلا ناول ''مورتی'' ہے۔ یہ ناول کم ناولٹ یا طویل افسانے کے مانند محبت کی تکونی کہانی پر مشتمل ہے۔ ''مورتی'' ملیحہ نامی ایک فنکار لڑکی کی کہانی ہے۔ وہ ایک مجسمہ ساز ہے۔ جس کی شادی ایک تاجر سے ہو جاتی ہے۔ اس کا شوہر اکبر علی خشک مزاج اور خالص تاجر ہے جس کا تہذیب و تمدن، ثقافت و کلچر اور فنکاری سے دور دور تک واسطہ نہیں۔ اس کا جمالیاتی ذوق اس قدر ناقص ہے کہ وہ بیوی کے حسن اور اس کی صلاحیتوں کی طرف سے بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ بیزار ہے۔ ملیحہ کی سہیلی کا دیور فیصل نئے زمانے کا ایک سلجھا ہوا نوجوان ہے جو اکثر اپنی بھابھی سے ملیحہ کے حسن کے چرچے سنتا رہا ہے اور داستانوں کے شہزادے کی طرح اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ دلّی آ کر جب وہ ملیحہ اور اکبر علی سے ملتا ہے تو اسے معلوم چلتا ہے کہ ملیحہ شادی شدہ ہے۔ تاہم اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ملیحہ فیصل کو اپنے فن کے نمونے دکھاتی ہے جو آدھے ادھورے ہوتے ہیں ان میں سے کوئی مجسمہ مکمل نہیں ہوتا ہے۔ ملیحہ کو کوئی اولاد بھی نہ تھی اور اکبر علی سے اس کے رشتے ذرا الجھے الجھے سے تھے۔ رفتہ رفتہ فیصل کی ہمدردیاں ملیحہ کو اس سے قریب کرنے میں معاون ہو جاتی ہیں۔ فیصل اس سے شادی کرنے کی درخواست کرتا ہے تو ملیحہ اسے ڈانٹ دیتی ہے۔ آخر کار ملیحہ اکبر علی کی بے توجہی سے پاگل سی ہونے لگتی ہے تو فیصل اس کی دلجوئی کے لیے اس کے فن کا مظاہرہ کروانے کی سوچتا ہے۔ نمائش کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے اور مقررہ دن پر جب فیصل اس کے گھر پہنچتا ہے تو ملیحہ بے ترتیب حالت میں گم صم بیٹھی نظر آتی ہے۔ سارے مجسّمے ٹوٹے پڑے ہو

تے ہیں۔اکبر علی اس کے سارے مجسّموں کو تہہ خانے سے نکلوا کر کباڑ کی طرح باہر رکھوا دیتا ہے۔ملیحہ یہ سب دیکھ کر ساکت مجسمہ کی مانند ہو جاتی ھے اور آخر کار طے ہوتا ہے کہ اسے پاگل خانے پہنچا دیا جائے۔ اس لمحہ فیصل اکبر علی سے ملیحہ کو مانگ لیتا ہے۔ترنم ریاض نے اس ناول میں عورت اور اس کے فن کی ناقدری کے آئینہ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آخر عورت اپنا شاستر کبھی لکھ بھی سکے گی یا نہیں؟

دورِ حاضر کی نسوانی ادیباؤں میں ثروت خان کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ان کا ناول ''اندھیرا پگ'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔جس میں بیوہ کی زندگی اور اس کی حالتِ زار پر آنسو بہانے کے بجائے، کم عمری کی شادی، لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ، بیوہ کی شادی کا مسئلہ، بے جا رسم ورواج کی پابندیوں سے آزادی کا مسئلہ یعنی کل ملا کر عورت کے وجود کی شناخت کے مسئلہ کو مرکز میں رکھتا ہے۔

پریم چند کی ''بیوہ'' اور ''اندھیرا پگ'' کی بیوہ کی روداد کا اگر موازنہ کیا جائے تو تاثر، درد، بیان، سوز اور حقیقت و جرأت سے اپنا حق مانگتی اگر نظر آتی ہے تو وہ ثروت خان کی بیوہ ہے۔بہ ظاہر موضوع پرانا لگتا ہے لیکن یہ ان معنوں میں نیا ہے کہ یہ آج کی جمہوریت اور اس کے نظام پر بہت بڑا سوالیہ نشان لگاتا ہے۔آزادی کا اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی آج کے ترقی یافتہ سماج میں عورت کے ساتھ درندوں جیسا غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے تو یہ اس نظام کے منہ پر زوردار طمانچہ ہی ہے۔ثروت خان جیسی بے باک مصنفہ نے اپنے مرکزی کردار روپ کنور کے ذریعے بڑے سوالات اٹھا کر پیش کیا ہے اور زمانے کی آنکھیں کھولی ہیں۔ترقی یافتہ زمانے کی چکا چوندھ میں ہم اس قدر منہمک اور محو ہو گئے ہیں کہ یا تو پرانی فرسودہ غیر انسانی روایات کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں یا خندہ پیشانی سے اسے قبول کر کے اس کو قسمت کے سر منڈھتے چلے جاتے ہیں۔گویا کوئی حل نہیں ملا تو اسے قسمت پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ثروت خان نے اسی موضوع کو راجستھان کی مارواڑی زبان اور عربی و فارسی کی تراکیب کے باہمی اشتراک کے اسلوب کی ایسی چاشنی میں پیش کیا ہے جو اردو ادب میں اس سے قبل نہیں دیکھی گئی۔مثلاً

> ''آپ تو جانڑوں ہی ہو، کنور سا، کی آپنڑا ای گاؤں میں کتنا سالوں بعد اندر مہاراج ری کرپا ہوئی ہے۔سو ساون راہنے میں کالے اینگ سُہا گڑیاں لہریا، پہن نے تالاب ری پوجا کرنے واسطے جاوے لی اور سینگ جنڈیاں آیا نڑیں موٹیار ری لمبی عمر ری اِچھّا کرے گا۔بھگوان مہارے موٹیار نے بھی چوکھا راکھے۔''(۳۲)

فارسی تراکیب:۔

یہ مہکتے پھول، یہ ادھ کھلے غنچے۔۔۔مُسکراتے لہلہاتے ان پھولوں کو ان کے مکیں انھیں چُھونے اور توڑنے دیں بھی یا نہیں۔۔۔یہ سب کچھ منحصر ہے! ان کی رَضا پر ۔مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ان خوشبوؤں کا رشتہ و ناطہ دل و دماغ سے اس طرح منسلک رہتا ہے کہ۔۔۔انہیں روک پانا، ان کی راہیں مسدود کر دینا۔۔۔کسی آلودگی کی باندھی ہوئی سرحدوں کی بندشوں کی دسترس میں نہیں۔۔۔انہیں سرحدوں کو توڑتی، اس کائنات کی رگ رگ میں سماتی یہ نرم رو بیار اور اس کے خوشگوار جھونکے۔۔۔جب سمندر کے ہمراہ آسمانوں تک کا سفر طے کرتے ہیں تو، صرف اس لیے کہ انہیں زمین کے ریزے ریزے میں سما جانا ہوتا ہے۔۔۔پانی کی ایک ایک بوند۔۔۔جو اجنبی و شناسا اور تپتی بنجر دھرتی کو صرف اس لیے شاداب کرتی ہے کہ اسے نمودے کر مخلوطی تہذیب کی تشکیل کر سکے۔۔۔یہ کائنات اور اس کا نظام۔۔۔یہ پانی۔۔۔یہ ہوا۔۔۔یہ سورج۔۔۔یہ آسمان۔۔۔سب بے حد منظّم۔لیکن اس کا محور۔۔۔اس کا مرکز۔۔۔یہ انسان۔۔۔نہ جانے کیوں برہم برہم سا۔۔۔ہمیشہ درہمی برہمی پر ہی کیوں آمادہ رہتا ہے۔۔۔!!! نہ جانے کیوں۔۔۔کیو۔۔۔ں۔۔۔ں؟ (۳۳)

اردو ادب میں راجستھان کو متعارف کرانے والی ثروت خان ہی ہیں جنہوں نے اپنے ناول میں راجستھان کی بولیوں، ٹھولیوں، تہذیب و کلچر، ثقافت وغیرہ کا بیان بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے جسے پڑھ کر قاری یہاں کی اور خاص طور سے مارواڑی علاقہ جیسلمیر، جودھپور، بیکانیر کے دیش نوک علاقہ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھتا اور محسوس کیا ہے۔مجموعی طور پر اندھیرا پگ مخصوص علاقائی حدود کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی ہندوستانی سماج کے ان دیرینہ مسائل کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے جو کم و بیش پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جس سے ہم نے آنکھیں موند رکھی ہیں۔

روپی جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے اس کی کم عمر میں شادی ہو جاتی ہے اور شادی کے چند روز بعد بیوہ۔۔۔یہ ایک ایسی سُہاگن ہے جس کے بیوہ ہو جانے کے بعد اس کے اپنے والدین کے گھر میں جہاں وہ بہت عیش و آرام اور ناز و نیاز سے پلی بڑھی ہوتی ہے مگر اب اس کی حالاتِ زندگی بد سے بدتر ہوتی

چلی جاتی ہے۔سماج کے غلط رسم رواج کا شکار ہوکر اپنی خواہشات کو دبا کر زندگی گزارنے پر روپی کو گھر والے ہی مجبور کر دیتے ہے۔روپی کا خواب ہے کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن کر گاؤں میں غریبوں کا علاج کرے مگر اس کی خواہش کو مار کر ماں باپ زبردستی سے اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی شادی کر دیتے ہیں۔جلدی ہی بیوہ ہونے پر وہ میکے لا کر پٹک دی جاتی ہے لیکن تمام تر پابندیوں، بندشوں کے باوجود اس کا عزم اس کی خواہش کی تکمیل کرتا ہے اور وہ اندھیرے سے اجیارے پگ کی طرف بڑے اعتماد سے قدم بڑھا دیتی ہے اور پیچھے رہ جاتا ہے سماج کا گھنونا مُکھوٹا۔قاری کا یہاں انکشاف ہوتا ہے کہ مضبوط ارادے انسان کی ترقی میں حائل قُفل کی کُنجیاں ہیں۔پھر چاہے سارا سماجی نظام ایک ہو جائے، آگے بڑھنے والا آگے بڑھ ہی جاتا ہے۔

ثروت خان نے اس ناول میں معاشرے میں پھیلے غلط رسم ورواج اور عورتوں کے دبے جذبات کے ساتھ سماج میں پھیلی مختلف قسم کی برائیوں اور ان کے بندھنوں میں چھٹپٹاتے لوگوں کی بے بسی کو جو آج بھی حقیقت ہے۔اس بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس ترقی یافتہ زمانے میں جہاں انسان اتنا آگے بڑھ گیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں آج بھی سماج میں عورتوں کی تعلیم پر روک لگا کر ان کے اعتماد کو سخت نقصان پہنچایا جاتا ہے۔زندگی کے ہر شعبہ میں صلاحیت کے باوجود عورت کو کم تر درجہ کا سمجھا اور مانا جاتا ہے آخر کیوں؟ انہیں سوالوں کے جواب تلاشتے ناول کے کرداروں کے عمل ردِعمل پر راجستھان کے کلچر کی مٹھاس اور رنگینی کے ساتھ ناول کے پلاٹ کا تانا بانا بنا گیا ہے۔جہاں ہر زندگی خود ایک سوال بنی ہوئی ہے۔روپی جوذہین اور روشن خیال لڑکی ہے اور بارھویں کلاس میں امتیازی حیثیت سے پاس کرتی ہے اور ڈاکٹر بننا چاہتی ہے مگر اس کے والد صرف سماج میں اپنی عزت بنائے رکھنے کے خاطر اس کی پڑھائی پر روک لگا کر شادی کرا دیتے ہیں کیونکہ قصبہ دیش نوک میں عورتوں کا زیادہ پڑھنا عیب مانا جاتا ہے۔روپی اپنے والد سے اپنا ادھیکار بھی مانگتی ہے مگر اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے اور پھر روپی کی شادی کرا دی جاتی ہے۔بدقسمتی یہ کہ شادی کے بعد جلد ہی شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ بیوہ ہو جاتی ہے۔اماوسیہ کی اندھیری گھُپ رات میں ''اندھیرا پگ'' کی رسم کی جاتی ہے۔یہ رسم مارواڑی علاقے میں پروہتوں کے یہاں ہوتی ہے۔جس میں بیوہ عورت کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور پردہ کیا جاتا ہے۔اس کی چھایا کسی پر نہ پڑے اس لیے اماوسیہ کی رات میں چپکے سے بیوہ کو اس کے میکے والے ہمیشہ کے لیے واپس اپنے گھر لے جانے کے لیے آتے ہیں اسے ہی اندھیرا پگ کی رسم کہا جاتا ہے۔

کیوں عورت ہی اپنی خواہشات پر قدغن لگائے؟ کیوں اپنے جذبات و اپنی جائز امنگوں کا گلا گھونٹے؟ آخر کیوں؟ اور کب تک؟ یہ ناول مرد اساس معاشرہ کی ذہنیت کا بھی پردہ فاش کرتا ہے اور ذہن کو جھنجھوڑ بھی دیتا ہے۔ یہ سوال نہ صرف مصنفہ اور اس کے قاری کے سامنے آتا ہے بلکہ آدھی دنیا کا سوال، باقی آدھی دنیا سے ہے! ناول میں یہی ایک مسئلہ درپیش نہیں بلکہ تعلیم، بچپن کی شادی (بال وواہ)، پردہ کا چلن، ایڈس جیسی بیماری کا مسئلہ وغیرہ بھی جو زندگی کے ساتھ لگے ہی رہتے ہیں۔ ناول کے مرکزی خیال کے اردگرد قصے کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا سیاسی نظام، ہمارا طبقاتی نظام، ذات پات، اونچ نیچ وغیرہ پلاٹ کے تانے بانے میں اس طرح پروئے گئے ہیں کہ مرکزی خیال کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ کردار نگاری اور منظر نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ بے حد جامع اور حقیقت سے قریب ہے۔

اسی دور کی ایک اور خاتون ناول نگار صادقہ نواب سحؔر ہیں۔ ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک سوانح ناول ہے۔ افتخار امام صدیقی اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

> ''حالیہ برسوں میں کم از کم ہندوستان میں جیلانی بانو اور ترنم ریاض کے بعد ایک بھرپور ضخیم ناول سامنے آیا ہے۔'' (۳۴)

''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' متاشا کی زندگی کی کہانی ہے جو وہ خود سناتی ہے یہ ایک پُجاری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے دادا کے خاندان کی مریادا کے خلاف اس کے والد انگریزی خاتون سے شادی کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ متاشا بن متر پور میں پہاڑوں کے بیچ اپنے والد کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی پیدائش پر اس کے والد بہت دکھی ہوتا ہے۔ وہ متاشا سے پیدائش سے ہی نفرت کرتے ہے۔ متاشا کو پہلا عشق اسکول کے زمانے میں ہوا پھر ایک دن اس کا عاشق ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ ملا۔ جس کی یاد اسے آخری وقت تک آتی رہی۔ دوسرا لڑکا یوراج تھا جس سے اس کی منگنی ہوئی مگر متاشا نے اسے ناپسند کر دیا۔ اس عمل میں اس کے پاپا کی کاروباری مجبوری حائل تھی پھر کچھ دنوں بعد اس کا داخلہ کلکتہ کے ایک کالج میں ہوا جہاں پر پربھا کرنام کے ایک پیر سے اپاہج لڑکے سے متاشا کو پیار ہو گیا اسی درمیان اس کے والد نے محلّے کے ایک لڑکے بھرتؔ جو دولت مند تھا اس کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کا ارادہ کیا لیکن متاشا موریشور کی بُری نیت کو تاڑ جاتی ہے اور اسے مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بھرت کو وہ بُری

طرح ڈانٹ دیتی ہے۔ایک دن پر بھا کر کی پٹائی ہوئی کیونکہ متاشا کے والد اس کی شادی بھرت سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ جھگڑا بڑھا اور آخر کار ماں نے جب بیٹی کی حمایت کی تو بدلے میں اسے گھر چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس جانا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد متاشا اپنی دادی اور باقی بھائی بہنوں کو لے کر وہیں چپکے سے چلی گئی۔ بھائی نے بے رخی دکھائی تو یہ خاندان چچا کے یہاں علی گڑھ آ گیا۔اس کے چچا سوریہ نے متاشا سے ناجائز رشتہ قائم کرنا چاہا، متاشا تیار نہ ہوئی اور آخر کار ان لوگوں نے کرائے کا مکان لے کر الگ رہنا شروع کیا۔علی گڑھ کے سفر کے دوران ہی ایک سردار منجیت نے متاشا کو پسند کر لیا تھا لیکن متاشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرائے کے مکان میں سمیر سے اس کی دوستی ہوئی اور پھر منگنی، لیکن متاشا کا باپ چونکہ علیحدہ تھا اس لیے سمیر کے والد نے رشتہ توڑ دیا پھر بھی سمیر متاشا سے حد درجہ پیار کرتا چلا گیا۔اس وقت بھی جب وہ نوکری کی تلاش میں بمبئی آ گئی یہاں کئی جگہ نوکری کرتے ہوئے اس کی ملاقات گوتم سے ہوئی، جو پانچ بچوں والا ادھیڑ عمر کا مرد جس سے متاشا نے شادی کر لی۔ وہ پیسے والا تھا، اب متاشا نے ماں سمیت پورے خاندان کو بلا لیا یہاں تک کہ گوتم کے پانچ بچوں کو بھی ساتھ رکھا اور ان کی پرورش سچے دل سے کی سب سے بڑے سوتیلے بیٹے انکیت میں عجیب سی کجی تھی۔اس نے متاشا پر بُری نظر ڈالی۔ باپ نے نظر انداز کیا پر گوتم کی لمبی بیماری سے متاشا پریشان تھی۔اس کے بھائیوں نے گوتم سے الگ کاروبار کیا کیونکہ گوتم انہیں اکثر ذلیل کرتا تھا۔ایک دن گوتم مر گئے تب متاشا کا اپنا بیٹا دیپو بہت چھوٹا تھا۔اب انکیت نے آہستہ آہستہ سارے کاروبار پر قبضہ جما لیا۔آخر کار ایک وکیل کی مدد سے متاشا نے اپنا حق لینا چاہا لیکن کوئی بہت زیادہ فائدہ نہ ہوا وہ اپنے سوتیلے بیٹے کے پاس دیپو کے ساتھ گئی وہاں بھی گزارہ نہ ہوا۔ دیپو ایک لڑکی نوبیتا سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ سیلس مین کی نوکری کر کے گھر چلاتا تھا ماں کو معلوم نہ ہوا کہ نوبیتا دیپو کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔اس غلط کام کے انجام سے ڈرتے ہوئے دیپو زہر کھا لیتا ہے آخر میں نوبیتا متاشا کے پاس آتی ہے اور سچ بتاتی ہے تو متاشا اسے اپنانے اور بچے کو پیدا کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔

اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں خواتین قلم کاروں کے ناولوں میں زیادہ تر عورت مرکزی کردار کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ان تمام ناولوں کی کہانی میں عورت، سماج، معاشرہ، کلچر اور انسانی رشتوں کی شکست وریخت کے اردگرد اپنا حلقہ تعمیر کرتی ہے۔ یہاں عورت پریشان ہے، جھنجھلائی ہوئی ہے، مضطرب ہے، خاموش ہے، ساکت ہے، غصّیل ہے، حق مانگ رہی ہے، زندگی مانگ رہی ہے، آسودہ

حالی مانگ رہی ہے، اپنی پہچان، اپنا وجود، اپنی زمین اپنا آسمان مانگتی نظر آرہی ہے۔اس کے حصہ میں اس قدر ناہمواریاں کیوں آتی ہیں کہ اس کا جینا کیوں محال ہوجاتا ہے یا محال کر دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ عصمت ہوں یا قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور ہوں یا جمیلہ ہاشمی، ترنم ریاض ہوں یا صادقہ نواب، ثروت خان ہوں یا شائستہ فاخری۔ تانیثی ناول نگار عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو اگر بار بار سامنے لاتی ہیں تو اس کی خاص وجہ ہی اس سماجی نظام کی وہ ناقص روایتیں، رواج اور سوچ ہے جو جنسی تفریق کے طور پر اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے صنف نازک کا استحصال کرتی رہتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے کم وبیش یکساں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کے ساتھ آج تک انصاف نہیں کیا گیا ہے لیکن اس روداد کو تانیثی ناولوں میں کس طرح کس طریقے سے پیش کیا جارہا ہے؟ اس پر دور حاضر کے نقاد ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے ایک مقالہ میں بخوبی روشنی ڈالی ہے:۔

> ''اردو میں ۱۹۸۰ء کے بعد کی خواتین ناول نگاروں نے زیادہ تر عصمت چغتائی کی روایت کو اپنانے اور اس کی توسیع کرنے کی سعی کی ہے یعنی sexual politics سے عورتوں کی زندگی میں جو المناکیاں پیدا ہوتی ہیں ان مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اگر صادقہ نے زبان اور تکنیک پر اور آشا پربھات اور ترنم ریاض نے غیر ضروری تفاصیل اور فکشن کی ساخت پر اور نسرین بانو نے آج کے فکشن کے مزاج پر نگاہ رکھی تو یقیناً اردو میں خواتین ناول نگاروں کا ایک عہد قائم ہو جائے گا۔ ان میں دو رائے نہیں کہ اندھیرا پگ کی مصنفہ ثروت خان نے ناول نگاری کی صنف سے حد درجہ آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور امید کہ وہ عصمت چغتائی سے بھی آگے کی کڑی ثابت ہونگی۔''(۳۵)

اسی دور کی ایک اور کامیاب ناول نگار آشا پربھات ہیں۔ انہوں نے اردو اور ہندی میں کہانیاں اور ناول لکھے ہیں، شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی کی ہیں جن میں ''دریچے'' (شعری مجموعہ ہندی میں) ''دھند میں اگا پیڑ'' (اردو ناول) ''مرموز'' (شعری مجموعہ اردو میں) ''میں اور وہ'' (ہندی ناول) اور ''جانے کتنے موڑ'' (ناول ہندی اور اردو) قابلِ ذکر ہیں۔ آشا پربھات تقریباً تیس برسوں سے مسلسل لکھ رہی ہیں، اس عرصے میں انہوں نے اپنی ایک الگ ہی پہچان بنائی ہے۔ فکشن ہو یا شاعری، ہر

میدان میں ان کی محنت، ریاضت اور دل سوزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کی تخلیقی کاوشوں سے تازہ افکار و میلانات کا احساس ہوتا ہے۔ناولوں کی طوالت میں جہاں وہ ضبط کا خاص خیال رکھتی ہیں ،وہیں جزئیات پر قابو پانے کا ہنر بھی جانتی ہیں ان کے ناولوں میں شعور اور لاشعور کے امتزاج سے ایک نئی سّری فضا تشکیل پاتی ہے۔

''جانے کتنے موڑ'' مصنفہ کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔اس ناول کی ہیروئن لتا جو سماج کے خود ساختہ اصولوں کی چکّی میں پس رہی ایک غریب عورت کی کہانی ہے ایک ایسی عورت جو سماج کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے اور اپنے ہر دکھ درد کو سہتی ہے۔وہ جب اپنے ارمانوں کا خون کر کے سماج اور صاحبِ ثروت لوگوں کے اصولوں پر چلتی ہے تو اس کی خوب عزت کی جاتی ہے وہ اپنے جذبات واحساسات سے سمجھوتا کرتی ہے تو سماج اسے سر آنکھوں پر رکھتا ہے لیکن وہی عورت جب حالات کی منجھدار میں پھنس جاتی ہے تو سماج یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔جب وہ اپنی زندگی کو اپنی شرطوں پر جینا چاہتی ہے، جب وہ اپنی سانس کی ڈور کو ٹوٹنے سے روکنے کے لیے حوصلہ جٹاتی ہے، جب وہ اپنی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کرتی ہے اور ایک ناخدا کی مدد سے اپنی زندگی کا بیڑا پار کرنے کے لیے ایک نئے ارادے کے ساتھ اٹھتی ہے تو سماج کو اپنی بنیادیں ہلنے کا احساس ہوتا ہے۔خود اس کا بیٹا اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ان سب کا احتجاج کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے:۔

> ''بہت جی چکی وہ ان رشتوں کے خاطر۔بہت قربان ہوئی وہ ان رشتوں کی پیروی پر۔والدین کی غربت پر، شوہر کی مجبوری پر، ساس سسر کی روایت اور اولاد کی خواہش پر۔وہ بھی انسان ہے محض خوشی یا عزت کا وارث نہیں۔اس کے اندر بھی جذبات ہیں، عمر کے اس حصہ میں اسے بھی ایک وفادار دوست کی ضرورت ہے۔سدھا کر اس کا شوہر نہ سہی ہم سفر تو ہے۔اگر وہ نہیں ہوتا تو روپیش اور روپا کی پرورش بھی سلیقہ سے نہ ہو پاتی اور یہ تمام دولت جس کے بل پر آج وہ اٹھلا رہا ہے رشتے داروں نے لوٹ لی ہوتی۔وہ روپیش کا باپ نہیں ہے پالنے والا تو ہے ہی۔کیا صرف جنم دینے والے مرد کو ہی باپ کہتے ہیں۔''(۳۶)

دراصل سماج تو اس وقت تک خوش رہتا اور عورت کو قبول کرتا ہے جب تک عورت اس

کے اشارے پر چلتی ہے لیکن جب عورت آزادی چاہتی ہے اور سماج کے اصولوں کو آنکھ دکھاتی ہے تو اس کی نظر میں عورت محض ایک داشتہ بن کر رہ جاتی ہے۔ جب عورت اپنی خوشی کے لیے کچھ خوشگوار لمحوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا چاہتی ہے تو سماج کو برُا لگتا ہے۔ عورت جب اپنی خوشی کو پورا کرنا چاہتی ہے تو سماج کی آنکھوں کا کانٹا بن جاتی ہے۔

جب ''لتا'' کو چند بیگھے زمین کی عوض میں حویلی والے خرید لاتے ہیں اور پھر ایک معزور، اپاہج شخص سے شادی کرا دیتے ہیں تا کہ حویلی کی شان برقرار رہ سکے اور لتا کو جب اپنے نندوئی کے ساتھ رات گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو سماج کا سر شرم سے جھکنے کے بجائے عزت وشان سمجھا جاتا ہے لیکن جب سدھا کر جیسے ہمدرد انسان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے تو اس کا اپنا خون بھی ساتھ نہیں دیتا۔ نندوئی جو اس کے ناجائز بچے کا باپ ہے، اس کو سماج کچھ نہیں کہتا لیکن سدھا کر کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے سماج طعنے دیتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس عمل میں سب سے اوّل اختلافِ روئے خود گھر اور خاندان والوں کی ہوتی ہے۔ باہر والے اس لیے حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لتا کی زندگی میں کئی موڑ آتے ہیں وہ ہر موڑ پر اپنے آپ کو سنبھال کر حالات سے مقابلہ کرتی ہے۔ جب اس کی شادی چند بیگھے زمین کے لالچ میں حویلی میں ایک لاچار و معزور سے کر دی جاتی ہے تو یہ ایک بڑا سوال بن کر ابھرتا ہے کہ کیا عورت کی خواہشات کی کوئی اہمیت نہیں؟ خود اس کی زندگی میں وہ اپنی مرضی سے ایک قدم بھی نہیں چل سکتی؟ کیوں حویلی کی شان کو بنائے رکھنا زیادہ ضروری مانا جاتا ہے؟ لتا کی زندگی میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی اپنی نند دودھ میں بھانگ ملا کر پلاتی ہے اور اس کا شوہر اس کے ساتھ ہمبستری کرتا ہے سبب یہ کہ ایک اولاد ہو جو اس حویلی کی وارث بن سکے لیکن اس حرکت پر سماج کیوں خاموش ہے؟ جب ساس سسُر اور شوہر کے انتقال کے بعد تمام کاروبار کو سنبھال کر اور بچوں کی ذمہ داری کو نبھا کر جب وہ اپنے مینجر سدھا کر سے محبت کر بیٹھتی ہے تو وبال کیوں کھڑا ہو جاتا ہے؟ کیا اسے اپنے طور پر اپنی زندگی جینے اور فیصلے لینے کا کوئی حق نہیں؟ عورت قید اور مرد آزاد؟

دراصل اس ناول میں آشا پربھات نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو سماج میں ہمیشہ مرد کی ماتحتی میں رہنا پڑا ہے۔ معاشرے میں عورت قدیم رسوم و روایات کی پاسداری کے

لیے ہمیشہ مجبور کی جاتی رہی ہے،اس میں جہاں ہندوستان کی تہذیبی شناخت نظر آتی ہے وہیں عورت کی اپنی مرضی اوراس کے جذبات کا خون بھی ہوتا ہے۔ جب لتا سدھا کر کو اپنا ہمسفر بنانے کی بات اپنے بیٹے روپیش کے سامنے رکھتی ہے تو اس کے جذبات کو سمجھنے کے بجائے اس کی دل کی بات کو تار تار کر کے رکھ دیتا ہے:۔

''روپیش اس قدر بے رحم کیسے بن گیا؟اس نے بھی اسے ایک جانور ہی سمجھا انسان نہیں۔اس بے زبان جانور کی مانند جس کا مالک جس وقت دل میں آئے رسی کس کر قصاب کے ہاتھ میں تھما دے نہ اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی نہ سُننے کی۔فیصلہ سنا دیا،دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔''(۳۷)

۲۰۱۱ء میں شاہینہ بیگم کا لکھا گیا ناول ''داستان ایک مثالی خاتون کی''ایک اصلاحی ناول ہے۔ یہ ناول ان کا پہلا ناول ہے۔جس میں انہوں نے عورت کے احساسات وجذبات کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔آپ خالص مشرقی مزاج خاتون ہیں جس کی جھلک ان کے ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ناول لکھنے کا سبب بتاتی ہے کہ:-

''خدا کرے مثالی خاتون سے دینی کام کرنے کی تحریک ملے اور ہر شخص اس کام کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اپنی اچھی صلاحیتوں کو اس کام میں لگا دے۔''(۳۸)

مصنفہ دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور تعلیم بھی دینی درس گاہ ''جامعۃ الصالحات رامپور'' سے حاصل کی پھر شادی بھی ایک دینی خاندان میں ہوئی اور یہاں نیک بیوی اور ماں کی طرح اپنے سارے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کیں۔کوئی بھی ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔فنکار کو خام مواد اپنے ماحول اور اردگرد سے ہی ملتا ہے اور اس خام مواد کا ادبی پارہ بننے میں فنکار کی مقصدیت بروئے کار لے آتی ہے۔انہوں نے یہ ناول اپنے والد ''حافظ شبیر احمد منظر قدوسی'' کی نگرانی میں لکھا۔

ان کا یہ ناول ایک طویل افسانہ یا ناولٹ کے مانند ہے یعنی مصنفہ نے کم سے کم لفظوں میں مطلب کی بات غرض کر کے ناول کو غیر ضروری طور سے طویل کرنے سے گریز کیا ہے۔ان کا یہ ناول نصیحت آمیز اور سبق آموز ہے۔جس میں ہر کردار اپنی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔

''داستان ایک مثالی خاتون کی''جو کے نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ شاہینہ بیگم نے اس

ناول میں عورت کا ایک زبردست مثالی کردار پیش کیا ہے اور ان کا ناول لکھنے کا بھی یہ ہی مقصد رہا کہ قاری اس ناول کو پڑھ کر دین کی تعلیم حاصل کر کے اپنے معاشرے کو خوشگور بنائیں، نیک کام کرے، دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ آخرت کو بھی سدھارے کیوں کہ اس عہد کی تعلیمی، اخلاقی اور ذہنی ترقی کی چمک دمک نے کس طرح نئی نسل میں بے چینی اور نا آسودگی پیدا کی ہے، آج کے ماڈرن سماج کی بے راہ روی اور بداخلاقیوں کو سامنے لا کر انہوں نے ایک طرح سے ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کے مسلم معاشرے میں بدحالی کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم، ہمدردی، دردمندی اور صالح اعمال کا جذبہ کم بلکہ ختم ہو رہا ہے۔اس ناول میں مسلم معاشرے کی نشوونما کرتے ہوئے سماج کے بگڑے مقاصد اور بے جا رسومات پر کھُل کر لکھا ہے۔

اس ناول کا مثالی کردار ''مہک حجاب'' ہے۔مہک حجاب جب شادی کر کے سسرال آتی ہے جہاں سسر اور شوہر دین دار ہیں مگر ساس جس کی پُرے گھر پر حکومت چلتی ہے وہ بے دین اور بدمزاج ہے۔ پر گھر میں آتے ہی اپنی خوش مزاجی، دینی تعلیم اور محبت سے اپنی ساس کا دل جیت کر نہ صرف دین کی راہ پر لاتی ہے بلکہ اس کے مزاج میں بھی شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ناول میں مہک کے کردار کا ذکر مصنفہ یوں کرتی ہے کہ:۔

> ''دو مہنوں تک مہک نے سسرال کے لوگوں کے مزاج اور گھر کے کاموں کو سمجھنے میں لگا دے۔اس دوران میں اس نے ساس، سسر اور شوہر کی ایسی خدمت کی کہ ساس اس کا کلمہ پڑھنے لگی۔گھر کے نوکروں کے دل جیت لیے، گھر میں نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا تھا اب اس کو پابندی سے اکثر لوگ نماز یں پڑھنے لگے۔''(۳۹)

سسرال کے علاوہ پڑوس کے گھروں میں بھی دین اور اسلام کی خوشبو پھیلاتی ہے، غریب بچوں کے لیے مدرسہ قائم کرواتی ہے۔جس کا بیان شاہینہ بیگم یوں کرتی ہیں کہ:۔

> ''تعلیم الاسلام کے ذریعے مسئلے مسائل کی تعلیم دینے لگی۔دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دس بچیوں کی جگہ بچیوں کا اچھا خاصا مدرسہ قائم ہو گیا۔''(۴۰)

مہک حجاب بچیوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان

غریب بچیوں کی شادی اور جوڑے جہیز کا بھی انتظام کرتی ہے۔اس نیک کام میں اس کی ساس پورا ساتھ دیتی ہے اور مدرسہ میں قرآن کی تعلیم عام کرواتی ہے اور اسلم جیسے غنڈے اور اس کے ساتھی غنڈوں کو بھی راہِ راست پر لاتی ہے اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ قدرت ایک وقت تک مہلت دیتی ہے ،جب اچانک بگڑتی ہے تو نہ دولت کام آتی ہے نہ چالاکی اور نہ دوست کام آتے ہیں۔اس ناول میں مصنفہ نے ہمارے سامنے آج کے سماج کا سب سے بڑا مسئلہ رکھا،وہ ہے ''شادی اور جہیز''۔

آج کے وقت میں لڑکیوں کی شادی کرنا آگ کا دریا پار کرنے سے کم نہیں ہے کیونکہ شادی اور جہیز نے ہر گھر میں ہاہا کار مچا رکھا ہے۔جہیز کی خواہش امیر آدمی تو پھر بھی پوری کر دیتا ہے، مگر غریب کی لڑکیوں کے لیے جہیز ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن جاتا ہے کیونکہ ایسے والدین بیٹی کے لیے اتنی بڑی رقم جوڑ نہیں پاتے جس سے شادی میں بہت سی پریشانیاں آتی ہیں یا پھر ان کی شادی ہی نہیں ہو پاتی یا پھر وہ بھاگ کر شادی کرتی ہیں۔مصنفہ ناول میں بتاتی ہیں کہ:۔

> ''شمسی صاحب نے کہا۔'' پیسے والوں کی دیکھم دیکھ مزدور بھی جوڑے کی رقم اور جہیز طلب کرنے لگے ہیں۔'' صمد صاحب نے کہا۔'' پیسے والے تو لڑکے کو خرید سکتے ہیں لیکن غریب کیا کریں؟'' شمسی صاحب نے کہا۔''اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے گھروں کی لڑکیاں غیروں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں یا اپنے بال سفید کیے گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں۔''(۴۱)

ایسے ہی مسئلے پر آگے لکھتی ہیں کہ:۔

> ساس نے کہا۔''غریب بچیوں کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ایک تو لڑکے غریب بچیوں سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔دوسرا اگر تیار ہو بھی جائے تو اس طرح کے مطالبے شروع کر دیتے ہیں۔لڑکی والے غریب لوگ ان کی مانگ کہاں سے پوری کریں؟''(۴۲)

مصنفہ جہیز کے بُرے رواج کو دور کرنے کے لیے تعلیم اور دینی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ان باتوں کو مصنفہ مہک حجاب کے کردار سے یوں بیان کروایا ہے:۔

> اردو کی ٹیچر نے خاص محبت کی جس کے نتیجے میں لڑکیاں اور شاعروں اور

ادیبوں کا کلام سمجھ سکتی تھیں۔ادبی مجلسیں منعقد ہوتی اور بچیوں سے ادبی تقریر اردو اور انگریزی میں کرائی جاتیں۔اس طرح خاص ماحول مدرسے کا بن گیا تھا۔محلے کی لڑکیوں کے شادیوں میں اگر دینا و دلانا کم بھی ہوتا تو لڑکے والے غریب اسکول کی تعلیم کو کافی سمجھتے۔شہر میں اس اسکول کی اچھی شہرت تھی اور یہاں کی تعلیم کو اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔شہر کا مالدار طبقہ اس اسکول کی بچیوں کو اپنی بہو بنانا فخر کی بات سمجھتا تھا۔''(۴۳)

وقت ضرور برق کی رفتار کی طرح تیز ہو رہا ہے لیکن آج بھی جہیز جیسے دیمک معاشرے کی جڑھوں کو کھوکھلا کرتے ہی جا رہے ہیں۔ان دیمک کو ختم کرنے کے لیے آج بھی خواتین ناول نگار جہیز جیسے اہم موضوع پر قلم اُٹھا رہی ہیں۔اور تعلیم کی اہمیت کو بتاتے ہوئے معاشرے کے افراد کے ذہن کو منور کرنے کی بھر پور کوشش اپنے ناولوں کے ذریعہ کر رہی ہیں۔

ابتدا سے لے کر حال تک کی خواتین ناول نگار کے ناولوں کا مطالعہ کرے تو یہ آخز نکلتا ہے کہ ہر خواتین ناول نگار نے اپنے نقطہ نظر کو بلندی پر پہچانے کے لیے اپنا راستہ خود بنانے کی کوشش کی ہے۔ان خواتین ناول نگاروں نے زندگی کے مدوجزو کو وقت کے دائرے میں سمیٹتے ہوئے اردو ناول نگاری میں اہم اضافے کیے ہیں۔

☆☆☆

حواشی وحوالہ جات:

(۱)۔بہار کی چند ادبی خواتین-ڈاکٹر آصفہ واسع،رسالہ:زبان وادب،نگارشات خواتین نمبر۲۰۱۰،ص۔۱۴
(۲)۔عورت زندگی کا زنداں۔زاہدہ حنا۔سٹی بک پوائنٹ کراچی،دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶۔ص۔۶۲
(۳)۔اردو ناول۔آغاز وارتقا ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء۔عظیم الشان صدیقی۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۲۰۰۸،ص۔۲۱۷
(۴)۔عورت زندگی کا زنداں۔زاہدہ حنا۔سٹی بک پوائنٹ کراچی،دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶،ص۔164
(۵)۔تانیثیت کی بنیاد گزار۔محمدی بیگم از نشاذ یدی،رسالہ اردو دنیا ۲۰۰۹،ص۔۲۸
(۶)۔ہندو پاک کی خواتین ناول نگار۔ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک۔شاہد پبلی کیشنز،نئی دہلی ۲۰۰۸،ص۔۵۷
(۷)۔ہندو پاک کی خواتین ناول نگار،ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک،شاہد پبلی کیشنز،نئی دہلی ۲۰۰۸،ص۔۵۲

(۸)۔حرماں نصیب،نذر سجاد حیدر،مرتبہ قرۃ العین حیدر،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۴،ص۔۸۹
(۹)۔داستان سے افسانے تک،وقار عظیم،ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ،۱۹۸۷،ص۔۱۲۰
(۱۰)۔عصمت چغتائی کے فن میں جنسی عناصر،فرزانہ نسیم،رسالہ نخلستان ۲۰۰۱۔ص۔۱۶
(۱۱)۔آبگینے(انٹرویو)مرتب نثار احمد صدیقی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۳،ص۔۱۷۵
(۱۲)۔اردو ناول کی فروغ میں خواتین کا حصہ۔عظیم الشان صدیقی۔ص۔۳۸
(۱۳)۔تلاش بہاراں۔جمیلہ ہاشمی۔اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۱۔ص۔۲۴
(۱۴)۔اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو،چار ناولٹ،قرۃ العین حیدر،ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۸۹،ص۔۷۵
(۱۵)۔زمین۔خدیجہ مستور۔ہمالہ بک ہاوس دہلی ۱۹۸۴۔ص۔۸۶
(۱۶)۔زمین۔خدیجہ مستور۔ہمالہ بک ہاوس دہلی ۱۹۸۴۔ص۔۵۴
(۱۷)۔زمین۔خدیجہ مستور۔ہمالہ بک ہاوس دہلی ۱۹۸۴۔ص۔۴۸
(۱۸)۔انتظار موسم گل۔رضیہ فصیح احمد۔مکتبہ علم وفن دہلی ۱۹۶۵۔ص۔۴۴
(۱۹)۔انتظار موسم گل۔رضیہ فصیح احمد۔مکتبہ علم وفن دہلی ۱۹۶۵۔ص۔
(۲۰)۔جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ۔مشرف علی۔ص۔۳۳
(۲۱)۔ایوان غزل۔جیلانی بانو۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر دہلی ۱۹۷۶۔ص۔۱۰۸
(۲۲)۔بین السطور اردو ناول پیش تر پروفیسر حمید سہروردی۔مصیر پبلیشر لکھنؤ ۱۹۹۸ص۔۵۷
(۲۳)۔بارشِ سنگ۔جیلانی بانو۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر دہلی ۱۹۷۶۔ص۔۴۵
(۲۴)۔تاریخ ادب اردو(ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)،وہاب اشرفی جلد سوم،ص۔۱۲۳۹،۱۲۴۰
(۲۵)۔تاریخ ادب اردو(ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)،وہاب اشرفی جلد سوم،ص۔۱۲۴۰
(۲۶)۔راجہ گدھ،بانو قدسیہ،شان ہند پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۸۸،ص۔۵۸
(۲۷)۔دستک نہ دو،الطاف فاطمہ،دارلاشاعت پنجاب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴۔ص۔۲۴
(۲۸)۔دستک نہ دو،الطاف فاطمہ،دارلاشاعت پنجاب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴۔ص۔۱۰
(۲۹)۔دستک نہ دو،الطاف فاطمہ،دارلاشاعت پنجاب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴۔ص۔۶۰،۱۶
(۳۰)۔دستک نہ دو،الطاف فاطمہ،دارلاشاعت پنجاب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴۔ص۔۱۰۴
(۳۱)۔دستک نہ دو،الطاف فاطمہ،دارلاشاعت پنجاب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴۔ص۔۲۰

(۳۲)۔اندھیرا پگ،ثروت خان،دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ پاؤس نئی دہلی ۲۰۱۵۔ص۔۳۶
(۳۳)۔اندھیرا پگ،ثروت خان،دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ پاؤس نئی دہلی ۲۰۱۵،ص۔۱۰،۱۱
(۳۴)۔کہانی کوئی سناؤ متاشا۔ڈاکٹر صادقہ نواب سحر۔ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی ۲۰۰۸،ص۔۱۱
(۳۴)۔مقالہ۔بیانیہ:عورت اور معاصر خواتین ناول نگار۔ڈاکٹر مولا بخش،ص۔۲۷
(۳۶)۔جانے کتنے موڑ۔آشا پربھات،ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی ۲۰۰۹،ص۔۱۶۲
(۳۷)۔جانے کتنے موڑ۔آشا پربھات،ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی ۲۰۰۹،ص۔۱۶۲
(۳۸)۔داستان ایک مثالی خاتون کی۔شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۷
(۳۹)۔داستان ایک مثالی خاتون کی،شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۴۵
(۴۰)۔داستان ایک مثالی خاتون کی،شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۴۶
(۴۱)۔داستان ایک مثالی خاتون کی،شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۳۶
(۴۲)۔داستان ایک مثالی خاتون کی،شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۶۰
(۴۳)۔داستان ایک مثالی خاتون کی،شاہینہ بیگم،ایچ۔ایس،آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۲۰۱۱،ص۔۵۳